جینے والے
عابد سہیل

جینے والے

عابد سہیل

جینے والے

پہلا ایڈیشن: ـــــ دسمبر ۱۹۹۸ء

تعداد: ـــــــــ ۶ سو

طباعت: مطبوعہ پاریکھ آفسٹ پرنٹنگ پریس، ندوہ روڈ، لکھنؤ

کتابت: ـــــــ عبدالسمیع قاسمی

قیمت: ـــــــــ ۸۰ روپے

ناشر: ـــــــــ مصنّف

ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز۔ امین آباد۔ لکھنؤ

Name of Book	:	Jeene Wale
Author	:	Abid Suhail
Nuber of Copies	:	750
Publisher	:	Abid Suhail
Printing Press	:	Parekh Offset
Price	:	Rs 80/-

Dustributors

Nusrat Publishers

Aminabad, Lucknow-226018

جینے والے

اور

۱۳ دوسرے افسانے

عابد سہیل

مصنّف کا نام : سیّد محمد عابد

قلمی نام : عابد سہیل

پیدائش : ۱۷؍ نومبر ۱۹۳۲ء

وطن : اورئی، ضلع جالون
(اترپردیش)

تعلیم : ایم۔ اے (فلسفہ)

پتہ : ۲۲۔ ایس۔ پی جرنلسٹ کالونی
سیکٹر سی۔ علی گنج
لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۲۴

والدۂ محترمہ

کے

قدموں میں

جن کے شوقِ مطالعہ نے

مجھے پڑھنے اور بعد میں
لکھنے کی طرف مائل کیا۔

یہ کتاب فخرالدین علی احمد یادگار کمیٹی، اتر پردیش، کے مالی تعاون سے
شائع ہوئی۔

فہرست

افسانے

سوا نیزے پر سورج

میری بڑی بیٹی سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی
میں نے پوچھا "کھیل چکیں؟"
"کیا کھیلیں؟" اس نے ہوا میں دونوں ہاتھ اٹھا کر جھلا دیے۔
"کیرم کیوں نہیں کھیلتیں؟"
"آپ تھوڑی دیر بعد کہیں گے تم لوگ شور کرتے ہو؟ ــــ اور پھر شگوفہ کھیلنے بھی تو نہیں دیتی ــــ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سب گوٹیں گڑبڑ کر دیتی ہے۔ خود تو کھیلنا آتا نہیں، ہمیں بھی نہیں کھیلنے دیتی۔"
"بچی ہے" میں نے کہا۔ "اپنی چھوٹی بہن کا خیال تو کرنا ہی چاہیے"۔ میں نے اپنے حساب سے سارا جھگڑا چکا دیا۔
"تو ہم کون سے بوڑھے ہو گئے ہیں، ہم بھی تو بچے ہیں"۔ فوزیہ نے سادگی اور بھولے پن سے کہا۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ واقعی ابھی وہ بچی ہی تو تھی۔ اس سے یہ امید کرنا کہ چھوٹے بھائی بہنوں کے جھگڑے چکائے، چھوٹی بہن کیرم کی گوٹوں کو کھیل کے درمیان بار بار بگاڑ دے تو غصہ ہونے کے بجائے انھیں پھر اپنی جگہ رکھ کر سجائے اور منائے، اسکے ساتھ ذرا زیادتی ہی تھی، اس لیے میں نے کہا۔

"تو تم دونوں لوڈو کیوں نہیں کھیلتیں؟"

"صبح تو کھیلا تھا۔"

"تو اور کھیلو۔"

"اور کیا کھیلیں؟" وہ منمنائی۔ "صبح جب سیف ہارنے لگے تو خفا ہو کر الگ بیٹھ گئے بولے، آپ ہمیشہ ہرا دیتی ہیں، ضرور بے ایمانی کرتی ہیں۔"

"تو ایسا کرو" میں نے ایک ترکیب نکالی۔ خود تو دو گوٹوں سے کھیلو اور اس کو چار گوٹوں سے کھیلنے دو۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" فوزیہ نے پوچھا۔

"ہوگا یہ کہ تم اچھا کھیلتی ہو تو جیتو گی ہی۔ اس طرح ممکن ہے سیف بھی کبھی جیت جائیں اور ان کی بھی خوشی ہو جائے۔"

"اس میں اچھا کھیلنے کی کون سی بات ہے" اس نے کہا۔ "یہ تو قسمت کی بات ہے۔ پانسہ میں جو بھی نمبر آجائے۔ بڑے چھوٹے سے اس کا کیا تعلق؟"

"پھر بھی۔"

"پھر بھی کیا ابو؟" — وہ پانسہ ڈالیں تو ان کی گوٹ بھی آگے بڑھاؤ، اس کا بھی خیال رکھو کہ ان کی گوٹ نہ پٹنے پائے، اس پر بھی ہار جائیں تو منہ پھلا کر بیٹھ جاتے ہیں۔"

سچ پوچھیے تو فوزیہ کی دلیل میں وزن تھا اور میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دوں کہ اتنے میں سیف میاں دوسرے کمرے سے آگئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے جو مجھے دیکھتے ہی بہہ نکلے۔

"ابو دیکھئے گڑیا ہمارے ساتھ کھیلتی نہیں" یہ کہہ کر سیف جو ہمیشہ فوزیہ کو گڑیا ہی کہتے تھے، بھوں بھوں رونے لگے۔"

فوزیہ نے جب دلیل کو آنسوؤں سے ہارتے دیکھا تو وہ بھی رونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد تینوں بھائی بہن پھر ایک جگہ مل جل کر کھیلنے لگے۔ کھڑکی سے جھانک کر میں نے دیکھا تو آنگن کی دوسری طرف باورچی خانہ کے پاس والان میں ان کھلونوں کی، جو امتحانات ختم ہونے کے بعد دوبارہ بچّوں کے قبضے میں آ گئے تھے، بارات سجی تھی۔ چھوٹی چھوٹی اینٹوں کا چولھا بنایا گیا تھا جس پر ایک چھوٹی سی پتیلی میں کھانا پک رہا تھا۔ سامنے گڈّے گڑیوں کا صوفہ سیٹ سجا تھا۔ بیچ میں ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ صوفوں پر آمنے سامنے گڈّے گڑیاں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے میز پر ٹین کی پھول دار رنگین پلیٹیں رکھی تھیں، جن میں بسکٹ اور ککڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھّے تھے۔ ٹین کی رنگین کیتلی اور چینی کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں، طشتریاں قرینے سے میز پر سجی تھیں۔ فوزیہ نے پتیلی پر سے طشتری اٹھا کر چمچے سے ایک آلو نکالا اور اسے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے دبا کر دیکھا اور بولی۔ "ابھی تھوڑی کسر ہے۔" تو شگوفہ نے گڈّے گڑیا کی طرف دیکھ کر کہا:

"ابھی کھانے میں تھوڑی دیر ہے آپ لوگ جب تک ناشتہ کیجیے۔"

میں اپنی ہنسی بمشکل ہی ضبط کر سکا۔ وہ اپنے کھیل میں اس طرح کھوئے ہوئے تھے کہ انھیں اس بات کا اندازہ بھی نہ ہو سکا کہ میں انھیں دیکھ رہا ہوں، ورنہ فوزیہ وہیں سے کہتی۔

"ابّو اللہ آپ اندر جائیے۔ دیکھیے ہم تو آپ کا کھیل نہیں دیکھتے ہیں۔"

میں مطمئن ہو کر کمرے میں چلا آیا۔ بیوی کسی عزیزہ کے یہاں گئی ہوئی تھیں، جو یکایک شدید بیمار ہو گئی تھیں۔ اُس گھر میں دو بچّوں کے خسرہ نکلا تھا۔ اس لیے تینوں بچّوں کو گھر پر ہی چھوڑ گئی تھیں۔ ان عزیزہ کا گھر کافی فاصلہ پر تھا۔ آنے جانے میں تین چار گھنٹے تو لگیں گے ہی ـــــ میرے لیے تینوں بچّوں کی دیکھ بھال کا یہ پہلا تجربہ تھا اس لیے شروع میں تو کچھ گھبرایا تھا کچھ الجھا بھی تھا لیکن اب ایسا لگ رہا تھا کہ میری پریشانی بلا سبب تھی۔ ویسے بھی اب بیوی کو گئے ہوئے تقریباً تین گھنٹے ہو گئے تھے اور

اب وہ واپس آتی ہی ہوں گی۔

یہ سوچ کر میں نے پلنگ پر دراز ہو کر اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی میں بہ مشکل دو تین خبریں ہی پڑھ سکا تھا کہ سیف میاں روتے ہوئے آئے۔

" ابو گڑیا آپا بڑی خراب ہیں۔ اپنی گڑیا کو دو دو پیالیاں چائے پلاتی ہیں اور میں نے کہا، میرے گڈے کو بھی ایک پیالی اور بنا دو تو بولیں، جانتے ہو شکر کتنی مہنگی ہے۔ آپ تو کل کہہ رہے تھے کہ شکر سستی ہو گئی ہے۔"

میں ہنسی بڑی مشکل سے روک سکا۔ پھر میں نے فوزیہ کو آواز دی۔

" فوزیا"

" جی ابو"

" سنو"

" آئی" کہتی ہوئی وہ آبراجی۔

"کیوں جی۔ تم سیف کے گڈے کے لیے چائے کی دوسری پیالی کیوں نہیں بنا دیتیں؟"

" ابو آپ جانتے نہیں۔ یہ بڑے حضرت ہیں، پہلے بولے ہمارا گڈا ککڑی اور بسکٹ زیادہ کھائے گا، اسے بھوک لگی ہے، تم اپنی گڑیا کو دو پیالی چائے پلا دینا۔ میں نے بسکٹ اور ککڑی کا چھوٹا سا ایک ٹکڑا اپنی گڑیا کو دیا اور باقی سب ان کے گڈے کو دیدیا۔ اب چائے بھی دوسری پیالی مانگ رہے ہیں۔"

" لیکن گڈے گڑیا تو کچھ کھاتے نہیں۔ وہ بسکٹ اور ککڑی ہوئے کیا؟"

" ہوئے کیا؟ خود کھا گئے" فوزیہ بولی۔

" اور تم نے نہیں دو دو پیالی چائے پی لی ـــــ اور بسکٹ ککڑی بھی تو کھایا تھا تم نے" ـــــ سیف رونے لگا۔

اسی لمحے شگو ایک ہاتھ میں کھلونے والی طشتری پیالی اور دوسرے میں بسکٹ اور

لکڑی کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اس طرح سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی کہ اگر ذرا بھی تیزی سے چلی تو چائے کی پیالی چھلک جائے گی۔

"ابّو یہ آپ کا حصہ ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا اور نہایت آہستگی سے پیالی اور طشتری تخت پر رکھ کر چھوٹے سے ٹین کے چمچے سے پیالی میں، جو بالکل خالی تھی، شکر چلانے لگی۔

بھئی اس میں تو چائے ہے ہی نہیں۔" میں نے کہا۔

"جھوٹ موٹ۔" کہہ کر اس نے پیالی میرے مونھ سے لگا دی۔

"بڑے مزے کی ہے۔" میں نے کہا تو فوزیہ بھی مسکرا دی۔ لیکن مجھے اپنی طرف دیکھ کر اس نے مونھ دوسری طرف کر لیا۔ سیف میاں اب بھی روہانسے تھے۔

اصل میں یہ لوگ صبح سے کھیلتے کھیلتے تھک چکے تھے۔ آخر کھیلنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اسکولوں میں گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوئے پندرہ بیس دن ہو چکے تھے۔ پہلے چھ سات دن تو ان لوگوں نے چھٹیوں کے خوب مزے لیے۔ رنگ برنگی تصویروں کی ہندی، اردو اور انگریزی کی جو بہت سی کتابیں میں نے ان دونوں کے لیے اکٹھا کی تھیں دو دو نہیں چار چار بار پڑھ ڈالا۔ پھر کئی دن لڑے جھگڑے بغیر کھیلتے رہے۔ اب کئی دن سے وہ حساب لگا رہے تھے کہ اسکول کھلنے میں کتنے دن باقی ہیں۔ اور ہر کھیل کا خاتمہ بھی لڑائی پر ہونے لگا تھا۔

ایک دم مجھے خیال آیا کہ پاس والے مکان کی بچی نازو کئی دنوں سے نظر نہیں آئی اور یہ لوگ بھی اس کے یہاں نہیں گئے۔ میں نے کہا۔

"اب تم لوگ نازو کے ساتھ نہیں کھیلتے؟"

"جب سے جھگڑا ہوا ہے اس کی دادی اسے آنے ہی نہیں دیتیں ہمارے یہاں۔" فوزیہ نے کہا۔

"تو تم لوگ چلے جایا کرو۔"

"امّی نے منع کر دیا ہے۔"

خالی چرخی ہاتھ میں تھی اور پتنگ آسمان پر ـــــ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو میں نے کہا۔

"اچھا اب تم لوگ سو جاؤ۔"

"امّی کب آئیں گی؟" شگوفہ نے پوچھا۔

"اب آتی ہی ہوں گی۔" میں نے تسلّی دی۔

"جب آئیں گی تب سو جائیں گے، مزے سے۔"

"نہیں" ـــــ میں نے "نہیں" کی "ی" کو ذرا کھینچ کر مصنوعی غصّے سے کہا "بس اب لیٹ جاؤ۔ لُو چلنے لگی ہے ـــــ اب دالان میں کوئی نہیں کھیلے گا۔"

میرے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر تینوں کمرے میں لیٹ گئے۔ فوزیہ اور سیف تخت پر اور شگوفہ میرے پاس مسہری پر۔

"آنکھیں بند۔" میں نے کہا تو تینوں بچوں نے آنکھیں بند کر لیں اور میں پھر اخبار پڑھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد کھُسر پھُسر کی آواز سن کر میں نے اخبار آنکھوں کے سامنے سے ہٹایا تو فوزیہ اور سیف شرارت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"سو جاؤ ـــــ" میں نے ذرا سختی سے کہا۔

دونوں نے خوب کس کر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر شریر مسکراہٹ اب بھی ان کے چہروں پر کھیل رہی تھی۔ میں پھر اخبار پڑھنے لگا۔ اور نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

تھوڑی دیر بعد میری آنکھ کھلی تو تخت خالی تھا، مسہری پر شگوفہ بھی نہ تھی۔ میں کچھ دیر تک خاموش بستر پر لیٹا رہا شاید اس انتظار میں کہ کسی کی آواز سنائی دے تو بلاؤں لیکن نہ کسی کی آواز سنائی دی نہ یہ اندازہ ہی ہوا کہ کہاں ہیں۔

میں نہایت خاموشی سے بستر سے اٹھا۔ سامنے والا دالان خالی تھا۔ کھلونے، صوفہ سیٹ

سب اسی طرح سجے تھے۔ اب مجھے ذرا تشویش ہوئی لیکن صدر دروازہ اندر سے بند دیکھ کر میری تشویش کم ہوئی۔ دوسرے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دراز سے جھانکا تینوں بچے کمرے میں موجود تھے۔

شگوفہ فرش پر دراز تھی۔ اس کا کرتا اوپر تک اٹھا ہوا تھا اور پیٹ پر پٹی بندھی تھی جس سے خون کی چھینٹیں جھانک رہی تھیں۔ میں گھبرا گیا۔ لیکن پاس والی میز پر لال روشنائی کی دوات الٹی پڑی اور میز پوش اس سے تربتر دیکھ کر میری گھبراہٹ تو دور ہو گئی تاہم معاملہ کیا ہے یہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ شگوفہ کے پاس ہی ترکاری کاٹنے والی چھری ایک پھٹے سے کپڑے پر رکھی ہوئی تھی۔ کپڑا جگہ جگہ سے سرخ ہو گیا تھا۔ سیف لکڑی کی ایک کھپنچی جس کے ایک سرے پر کپڑا لپٹا ہوا تھا ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا۔ اور فوزیہ سے کہہ رہا تھا۔

"مٹی کا تیل تو اسٹوو میں ہے اور اسٹوو مل نہیں رہا ہے۔"

"وہیں کہیں ہوگا۔ کچن میں الماری کے نیچے دیکھو۔"

"اچھا کہہ کر سیف نے دروازہ کھولا تو مجھے دیکھ کر پہلے تو کچھ حیران سے ہوئے پھر مسکرائے اور فوراً ہی کمرے میں لوٹ گیا۔ میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر شگوفہ بھی فرش پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

فوزیہ نے میری طرف دیکھا اور پلک جھپکائے بغیر بولی۔

"ہم لوگ شیعہ سنّی لڑائی کا کھیل کھیل رہے ہیں۔"

■■

جینے والے

جودھے نے اپنی ٹانگیں دھیرے دھیرے بڑھائیں یہ دیکھنے کے لیے کہ جیتی کے برخلاف، جو ایسی بے خبر سوتی ہے کہ اُسے کھُلے ڈھکے کا بھی خیال نہیں رہتا وہ سونے میں بھی آدھا جاگتا رہتا ہے کتنی دور تک اپنے پیر پھیلا سکتا ہے۔ تو بس ذرا کی ذرا میں اس کا انگوٹھا شندو کے سر سے ٹکرا گیا اور اس نے جلدی سے اپنی ٹانگیں سکوڑ لیں۔

"ابھی سویا نہیں رے،" شندو نے پوچھا اور وہ جواب دینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ سڑک پر ایک ٹرک اتنی تیزی سے گذرا کہ پُل کی منڈیر تو کیا سارا پُل ایسے کانپنے لگا جیسے اس کا دل اس دن کانپا تھا جب اس نے جان بوجھ کر اپنی ٹانگیں دھیرے دھیرے جیتی کی طرف بڑھائی تھیں اور اس نے اپنے پیر کی انگلیوں کو اس کی ادھ کھُلی ٹانگوں پر اس طرح بے جان چھوڑ دیا تھا جیسے یہ سب کچھ انجانے میں ہو گیا ہو۔

ٹرک کا شور اور پُل کا کانپنا ایک ساتھ تھمے اور اس نے کچھ کہنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ شندو پھر بول اُٹھا۔

"اب سو جا۔۔۔۔ بارہ کا گھڑیال بجا ہی چاہتا ہے اب بھی نہ سویا تو کب سوئے گا۔ تین بجے صبح سے تو پھر ٹرکوں کا تانتا بندھ جاتا ہے اور بھونپو اتنی زور سے بجاتے ہیں کہ ایک بار تو مردہ بھی زندہ ہو جائے۔۔"

مُردے کے زندہ ہوجانے کی بات پر جودھے کے دماغ میں جواب گڑبڑا گیا۔ کہنے تو وہ یہ جا رہا تھا کہ نیند نہیں آرہی ہے، پر اس کے مونہہ سے نہ جانے کیسے نکل گیا ــــ "مُردہ زندہ ہوجاتا ہے تو شرفو نہ زندہ ہو گیا ہوتا؟"

شرفو ــــ وہی نہ جو پچھلے سال جیٹھ کی رات میں نیچے نالے میں گر کر مر گیا تھا۔"

"بے چارہ شرفو ــــ" جودھے نے کہا۔

" ہوسکتا ہے ایک منٹ کے لیے زندہ بھی ہو گیا ہو۔ پر اپن کو تو اگلے دن جب منڈیر پر اس کی جگہ خالی رہ گئی تھی، تب اس کے غائب ہونے کا پتہ چلا تھا۔ پھر اگلی صبح اس کی ڈھنڈھیا مچی تھی تو لاش نالے میں پڑی ملی تھی۔ "

"سالے نے کروٹ لی ہو گی جب ہی تو گر پڑا ــــ" جودھے نے کہا۔ ویسے تھا دل کا اچھا۔ لیکن ذرا کام چور تھا۔ خوب جی مار کر دن بھر ٹھیلا کھینچتا تو اتنا تھک جاتا، اتنا تھک جاتا کہ کروٹ بھی نہ لے پاتا۔ کام چوری کی سزا اچھی ملی۔"

"تھا دل کا اچھا ــــ" تندو نے جودھے کا جملہ دُہرایا۔

"پر تھا سچ مچ کام چور۔ اس دن جس کی رات کو وہ نہیں رہا۔ ٹھیلا کھینچتے کھینچتے میرے پیٹ کے نیچے کا حصہ چھل گیا تھا۔ سیٹھ نے مال ہی اتنا لاد دیا تھا کہ رکاب گنج کی چڑھائی، اتنا سامان اور پیچھے سے زور لگانے والوں میں شرفو۔ بابا! بہیہ گڈھے میں پڑا۔ ٹھیلے نے ایکدم موڑ کھایا تو اگلا حصہ ہوا میں لہرا کر سامنے سے آتے والی بس سے ٹکرا گیا وہ تو کسمت تھی کہ میرا شریر ستک کر نیچے سڑک پر گر گیا، نہیں تو شرفو رات میں مرا میں دن ہی میں ختم ہو گیا ہوتا۔"

"سچ بتا ــــ تو نے ہی اسے رات میں دھکا تو نہیں دے دیا تھا۔" تندو نے آہستہ سے پوچھا کہ کوئی اور نہ سُن لے۔

" میں ایسا نہیں ہوں ــ" کہہ کر جودھے نے اپنی جیب ٹٹولی۔ ایک بیڑی نکالی، اسے

جلانے کے بعد لمبا سا کش لیا اور بولا۔

" تو بھی پیے گا ؟ "

" ہاں دے دے۔ نیند نہیں آرہی ہے۔ بیڑی ہی پیوں ۔۔۔ لیکن سچ سچ بتا دے کہیں دن کا غصہ رات کو تو نہیں اتارا تھا۔ میں نے بھی بہت دنوں ٹھیلا گھسیٹا ہے جانتا ہوں کہ جب مال زیادہ لدا ہو اور پیچھے سے سہارا نہ مل رہا ہو تو کتنا غصہ آتا ہے اور اس دن تو تو اس کے کارن مرتے مرتے بچا تھا۔ "

شندو اپنی بات دھیرے دھیرے، تھم تھم کر خفتی دیر کہتا رہا، جودھے جلدی جلدی بیڑی کے کش لگاتا رہا۔ پھر جب بیڑی کا جلتا ہوا حصہ اس کی انگلیوں کے بالکل پاس پہنچ گیا تو اس نے بیڑی نیچے نالے میں پھینک دی اور ذرا غصہ میں بولا۔ " ایسی بات کرے گا تو بیڑی نہیں دوں گا۔" اور اپنا بڑھا ہوا ہاتھ جس میں دو انگلیوں کے بیچ بیڑی دبی ہوئی تھی اپنی طرف کھینچ لیا۔

" ارے اس میں ایسی غصہ ہونے کی کیا بات ہے۔ میں نے تو مذاک کیا تھا۔ تو کیوں اسے دھکا دیتا۔ تو تو اس وقت بھی منڈیر پر سوتا تھا۔ اس کے مر جانے سے تیرا نمبر آنے والا ہوتا تو بھی ایک بات ہوتی۔ "

جودھے کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ اس نے بنڈل سے ایک بیڑی اور نکالی اور پھر اس کو انگلیوں کے بیچ میں دبا کر دیا سلائی کی ایک تیلی بچانے کے لیے انھیں ایک ساتھ جلایا۔ تیلی بجھ گئی تو بیڑیوں کے سروں کو دیکھا۔ ہاتھ ہوا میں لہرایا تو ان کے سرے چمک اٹھے، پھر ایک اپنے موہنہ میں لگائی اور دوسری شندو کو دے دی۔

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا۔ پھر ایک ٹرک شور مچاتا ہوا گزرا اور سڑک اور منڈیر پر روشنی پھیل گئی تو دونوں کی نظر جیسے ایک ساتھ چینی پر پڑی جو تن بدن سے بے خبر دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے لیٹی تھی۔ دونوں ہی شاید بات چیت کا سلسلہ جاری رکھنے

کے لیے کچھ سوچ رہے تھے کہ ان کے مونہہ سے تقریباً ایک ساتھ نکلا:

"دن بھر نہ جانے کہاں کہاں ماری ماری پھرتی ہے۔ کیسی بےکھبر سو رہی ہے۔"

"پرسوں تو رات کو بھی نہیں تھی۔"

"چار دن کی چاندنی ہے۔" جودھے نے عقل مند بننے کی کوشش کی۔ "اس کے بعد جب کوئی نہ پوچھے گا تب تو سیدھے مونہہ بات کرے گی۔" جودھے نے جملہ پورا کیا۔

"لیکن شرفو اسے سچ مچ چاہتا تھا۔"

"بےچارہ شرفو۔"

"لیکن اس نے گھاس نہیں ڈالی" ــــ نندو کو واقعی اس کا افسوس تھا۔

"ابھی تو نے کہا تھا نا کہ" جودھے بولا "کہیں نے شرفو کو دھکا دے دیا تھا۔ اب میرے دل میں کھیال آیا کہ اگلی شام کو جب اس نے اس کی جگہ خالی دیکھی تھی اور سب کو جیسے ایک دم یاد آگیا تھا کہ انھوں نے اُسے نہ صبح دیکھا نہ دن میں کسی وقت نہ پھر شام کو تو عبدل کتنا خوش خوش لگ رہا تھا۔ اس نے اپنا انگوچھا کتنی شان سے شرفو کی جگہ بچھا دیا تھا اور کیسے مزے سے لیٹ گیا تھا۔"

نندو نے کچھ سوچا اور بولا "ہاں ہاں مجھے بھی یاد پڑتا ہے۔" وہ اس دن بہت خوش تھا اور پھر اُس نے سب کو آدھا آدھا کوپ چائے بھی پلائی تھی اور ایک ایک بیڑی بھی بانٹی تھی۔

"تو کہنا کیا چاہتا ہے؟" جودھے نے پوچھا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ جب سب سو گئے ہوں اور رات کے بارہ ایک بجے کے بعد سواریوں کا آنا جانا بالکل رُک گیا ہو اور ٹرک بھی نہ آ جا رہے ہوں تو اس نے چپکے سے اٹھ کر شرفو کو دھکا دے دیا ہو۔"

"ہو تو سکتا ہے۔" جودھے نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"اور پھر اگلے دن شام کو سب سے پہلے اسی نے تو کہا تھا کہ شرفو اب تک نہیں آیا۔"

"ہاں یہ بھی یاد پڑتا ہے۔" نندو نے ایک سال پرانی بات یاد کی۔

"پر ایک بات ہے، سچ سچ کہوں ـــ" جودھے بولا۔

"کہو ـــ!"

"جب تجھ کو منڈیر پر سونے کی جگہ ملی تھی، شرفو کی موت سے ایک سال پہلے، راما نن کے نالے میں گرنے کے بعد تو تو نے اُس رات کو نوٹنکی کی کہانی سُنائی تھی۔ خوب خوش ہو ہوکر اور لہک لہک کر گانا بھی سُنایا تھا ـــ کیا تھا وہ ـــ" میں تو لیلیٰ ہی لیلیٰ پکارا کروں۔"

اب نندو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "تو کہنا کیا چاہتا ہے۔ میں نے راما نن کو دھکا دے دیا تھا کیا ـــ؟ کہ سڑک کے کنارے سونے کے بجائے پُل کی منڈیر پر جگہ مل جائے۔ یہی کہنا چاہتا ہے نا؟ ـــ"

"نہیں نہیں، میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا۔ بس ایک کھیال آ گیا۔"

"لیکن شرفو میں اور کوئی عیب نہ تھا۔ ذرا کام چور تھا اور ڈرپوک ـــ" نندو نے بات بدلی۔

"ڈرپوک۔" جودھے نے حیرت سے کہا۔

"ڈرپوک نہ ہوتا تو جیتی کو بس اشاروں میں پیار کرتے کرتے جان دے دیتا۔ آٹھ دس روپے تو روز کماتا ہی تھا۔ دو روپے اس کی طرف سیدھے سیدھے پھینکتا۔ پھر دیکھتے کیسے آنا کانی کرتی۔ لیکن ہمت ہی نہ کر سکا۔ کون جانے جب بھدے سے نیچے گرا ہو تو اس نے یہی سوچا ہو کہ جیتی کی گود میں گر گیا ہے۔"

"کھی کھی، کھی کھی۔" دونوں ہنسے لیکن پھر جیسے ایک ساتھ انہیں اپنی اپنی بیوقوفی کا احساس ہوا اور دونوں نے بس ذرا آگے پیچھے کہا ـــ "بے چارہ شرفو ـــ"

اسی وقت سڑکوں کے بلب جو شام سے اندھیرے پڑے تھے ایک دم جل اُٹھے تو دونوں کی نظریں پہلے چینی سے ٹکرائیں اور پھر ایک دوسرے کی نظروں سے اور جیسے دونوں ہی شرمندہ ہو گئے۔

"شرفو تو اسے آنکھ بھر کے دیکھتا بھی نہیں تھا۔"

"وہ چینی کو شرافت سے رام کرنا چاہتا تھا۔"

جودھے نے غصّے سے کہا اور مڑ کر پُل کے نیچے تھوک دیا۔

"اچھا اب سو جا ـــــ صبح سیٹھ نے جلدی بلایا ہے۔ گودام سے مال اسٹیشن لے جانا ہے۔"

لیکن جودھے کو نیند اب بھی نہیں آ رہی تھی۔ سو اس نے نئی بات چھیڑ دی۔ "تو مار کہ ڈلائی کتنی لیتا ہے۔؟"

"ایک روپیہ بنڈل۔" نندو نے کہا۔

"لیکن بابو نے اب جو تی سے اکنّی کر دی ہے۔ تو نے نہیں بڑھائے۔ بابو نے اپنی سوت بڑھا دی ہے تو ہم نے بھی اپنی بے ایمانی بڑھا دی ـــــ" جودھے بولا۔

"اچھا اب سو جا ـــــ" نندو کی آنکھیں اب شاید نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

دونوں سیدھے لیٹے لیٹے تھک گئے تھے۔ دونوں ہی نے کمر کو کچھ پیچھے کر کے سر اور ٹانگیں آگے کی طرف بڑھا کر کروٹ لی، ہاتھ پھیلا کر ٹٹولا کہ منڈیر کے بیچوں بیچ میں ہیں کہ نہیں۔ پھر جودھے تھوڑی دیر بعد سیدھا سیدھا لیٹ گیا۔ نندو نے بھی اسی احتیاط سے دوسری طرف کروٹ لی اور ان کے خراٹوں سے عبدل کی آنکھ کھل گئی تو وہ بڑبڑایا۔

"سالے سونے بھی نہیں دیتے۔۔"

صبح سب سے پہلے نندو جاگا۔ اسے کام بھی بہت تھا۔ گودام کھلتے ہی ٹھیلے پر مال لد جائے تو ایک پھیرا اور ہو جاتا ہے۔ اور ایک پھیرے کے معنی ہوتے ہیں چھ سات روپے

اوپر کے۔ پچھلی برسات میں جب وہ گاؤں گیا تھا تو اس کی بیٹی نے چُندری کی فرمائش کی تھی۔ اُسے اس وقت اپنی بیٹی کا بھی خیال آیا اور بیوی کا بھی ۔۔۔" ایک ۔۔۔ دو ۔۔۔ تین ۔۔۔" اس نے سات تک انگلیوں کے پوروں پر گنتی کی۔ سات سال ہو گئے اسے لکھنؤ آئے ہوئے۔ اس بیچ گاؤں کے بس سات آٹھ ہی پھیرے ہوئے تھے۔ سال میں ایک فاصل دورہ اس وقت ہوا تھا جب اس کی ماں اُسے یاد کرتے کرتے پرلوک سُدھار گئی تھی ۔۔۔ اُسے ماں کے مرنے کی خبر کئی دنوں بعد گاؤں کے ایک آدمی سے ملی تھی۔ اور وہ دو دن بعد سیٹھ کے گاہکوں کے سارے کام جلدی جلدی نپٹا کر گاؤں چلا گیا تھا۔ گھر میں کیسا سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ اُسے ایسا لگتا تھا جیسے ماں بس ابھی ابھی مری ہو۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے سب کچھ پرانا سا ہو گیا تھا۔ جہاں دن بھی کام ہو، رات بھی کام، سکون کا ایک لمحہ بھی نہ ہو وہاں سب کچھ کتنی جلدی جلدی ٹھیک ٹھاک ہو جاتا ہے۔ ان سات برسوں میں اس کی بیٹی چمپا کتنی بڑی ہو گئی تھی۔ پچھلے سال برسات میں جب وہ گاؤں گیا تھا تو چمپا کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اپنا بدن چرائے چرائے وہ اس کے سامنے آئی تھی۔ اور اس کے بار بار پوچھنے پر اس نے لال چندری کی فرمائش کی تھی، ایسی چندری جس میں گول گول چاند ایسی ٹکیاں لگی ہوتی ہیں ۔۔۔ "کتنے میں ملے گی۔؟" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ " ہو گی کوئی دس بارہ روپے کی ۔۔۔" اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو اطمینان دلایا۔

وہ گاؤں، بیوی، ماں اور چمپا کے خیالوں میں جانے کتنی دیر کھویا رہتا لیکن ایک تو سڑک چلنے لگی تھی، رکشے اور دوسری سواریاں تیزی سے گزر رہے تھے اور پھر کلو خاں کے لڑکے راج بلی نے جس کے ایک ہاتھ میں بانس کی ٹوکری تھی جس میں کلڑھ تھے اور دوسرے ہاتھ میں چائے کی بڑی سی کیتلی، زور سے آواز لگائی تھی۔

" جس کو چائے لینا ہو فٹافٹ لے لے۔"

اس کی آواز سنتے ہی منڈیر کے سارے سونے والے اپنے اپنے ڈنلپ پلو کے بستروں

سے ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے ۔۔۔ کسی نے پُل کے کونے والے نل سے کُلّی کی۔ کسی نے مونہہ ہاتھ دھویا اور کوئی یونہی چائے کا ایک کوپ چڑھا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پُل کی منڈیر خالی تھی۔ سڑک جاگ پڑی تھی، شہر جاگ اٹھا تھا، دوکانوں کے شٹر دھڑ ادھڑ کھلنے لگے تھے۔ اور رکشوں، موٹروں اور اسکوٹروں پر چلنے والوں میں سے کسی کو خیال بھی نہیں رہا تھا کہ رات جب ڈوبتی ہے اور سڑک جب اونگھتی ہے تو پُل کی یہ منڈیر آباد ہو جاتی ہے۔

پھر سارے دن کی لُو، دھوپ میں شام کا انتظار کر کے رات جب سوئی تو منڈیر پر سونے والوں کا دن ختم ہوا۔ کوئی دوکان داروں سے مزدوری پر جھگڑ کر لوٹا تھا، کوئی ایک چکر کا کھیلا کر کے سیٹھ کو آٹھ دس روپے کا چُل دے کر، کوئی ہار کر، کوئی جیت کر اور کوئی ایسا کہ نہ جیتا تھا نہ ہارا تھا۔

جودھے نے پٹرول پمپ کے پاس والے ڈھابے میں کھانا کھایا۔ مُنکی کے نل سے ہاتھ دھو کر باہر نکلا تو چمپتی چاٹ کے ٹھیلے کے پاس دونا چاٹ رہی تھی۔

"بہت مجا آ رہا ہے۔" جودھے نے چھیڑا۔

"چل حرامی کے پلّے ۔۔۔ نہ بدے ۔۔۔" چمپتی بولی۔

"گھانٹھ سے رکم کھرچ کرتے جان جاتی ہے اور دونا دیکھ کر مونہہ میں پانی بھر آتا ہے۔ پیسے کھرچ کر اور دونا لے کر تو بھی مجا لے ۔۔۔ اس نہ بدے پن سے کیا ہو گا۔"

جودھے کا دل اس ڈھکے چھپے اشارہ پر جو ایسا ڈھکا چھپا بھی نہ تھا، ایک بار ڈولا تو لیکن پھر اُسے چمپا کی چاند تارے ٹنکی چندری یاد آ گئی اور وہ رال پی گیا اور بیڑی سلگا کر پُل کی طرف چل پڑا۔

رات اور ڈوبی تو جیسے سب کو ایک دم خیال آیا کہ نصیبے کی جگہ خالی ہے۔

" نصیبے جانے کہاں رہ گیا ہے ؟" شندو نے کہا۔

"آتا ہوگا ــــ بائیسکوپ دیکھنے چلا گیا ہوگا۔"

"ہوسکتا ہے ــــ" عبدل بولا۔

پھر رات کچھ اور ڈوبے اور نصیبے کی جگہ پھر بھی خالی رہی تو جودھے نے کچھ ایسے کہا جیسے اسے کوئی اور بات کرنے کو نہیں مل رہی تھی۔

"نصیبے اب بھی نہیں آیا۔ پہلا سو تو کب کا چھوٹ گیا ہوگا۔"

"صبح تو سایہ تھا ــــ" عبدل نے عقلی گدا مارا۔

"میں نے تو نہیں دیکھا ــــ" شندو بولا۔

"مجھے بھی نہیں یاد پڑتا ــــ" جودھے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کون ــــ نصیبے؟" چیتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔" سوتا تو منڈیر کے کونے پر تھا ــــ لیکن چائے میرے پاس ہی بیٹھ کر پیتا تھا۔ پر آج صبح وہ تھا یا نہیں، یہ تو مجھے بھی یاد نہیں پڑتا ــــ"

"بھائی، کسی نے نصیبے کو صبح دیکھا تھا۔؟" بوڑھے کاکا نے جو کئی برسوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گاؤں واپس جانے کی بات کر رہے تھے، اونچی آواز میں پوچھا۔

سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس رات کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ نصیبے کی جگہ خالی رہی۔ لائن میں لگا بلٹو جو کئی برسوں سے منڈیر پہ سونے کی باری کا انتظار کر رہا تھا پہلے کی طرح منڈیر کے نیچے سڑک کے کنارے ہی سو گیا۔

اگلی صبح سب سے پہلے جودھے اُٹھا۔ منڈیر سے نیچے جھانک کر اس نے دیکھا تو نالے کے بیچوں بیچ کوئی لمبی لمبی چیز پڑی تھی۔

دیکھو تو شندو نالے میں کیا پڑا ہے۔؟"

شندو نے تقریباً آدھا بدن لٹکا کر پل کے نیچے دیکھا پھر دو ایک بار آنکھیں ملیں۔

"یہ تو نصیبے ہے، اس کالال انگوچھا گردن میں لپٹا ہوا ہے۔"
اور تھوڑی ہی دیر میں نصیبے کی موت کی خبر پل کی منڈیر کے اِس کونے سے اُس کونے تک پھیل گئی۔

شام ہوئی اور سامنے کے ہوٹل کو بجلی کے بلبوں سے خوب سجایا گیا تو جودھے کو جانے کیسے ایک بات یاد آگئی۔
"شندو تجھے یاد ہے نا پچھلی سال شرفو بھی کل ہی کے دن منڈیر پر سے گر کر مرا تھا۔"
"کل ہی کے دن ـــ" شندو بولا۔ "یہ تو یاد نہیں پر اتنا جرور یاد ہے کہ تھے خوب گرمیوں ہی کے دن۔"
"تجھے دن کیسے یاد رہا۔؟"
"یہ سامنے والا ہوٹل اس دن بھی خوب سجایا گیا تھا۔ رات بھر گانا بجانا ہوتا رہا تھا۔"
جودھے نے کہا۔
"ہاں ہاں، اب یاد آگیا۔ اس دن بھی یہ ہوٹل خوب سجا تھا۔" شندو کو سب کچھ یاد آگیا۔
"اور اس سے بھی ایک سال پہلے جب راما ئن منڈیر سے گر کر مرا تھا تب بھی۔"
"ہاں اس کے اگلے دن بھی ہوٹل خوب سجا تھا۔" جیتی بولی۔ "مجھے خوب یاد ہے۔"
"تو اس کا مطلب ہے۔" جودھے نے اپنی ٹانگیں بلا سوچے سمجھے منڈیر پر پھیلا دیں۔
"اب ایک سال کی چھٹی ـــ خوب ٹانگیں پھیلا کر سوؤ۔ کچھ ہونے والا نہیں۔"
وہ سارے دل جو نصیبے کے نالے میں گر کر مر جانے سے بوجھل تھے، اُن پر سے بوجھ ایک دم ہٹ گیا تھا۔ اب ایک سال کو موت کی چھٹی ـــ بات بالکل پکی تھی۔

■■

تیسرا خط

مجّو چچا کا یہ تیسرا خط تھا۔

"دیوار سے ملحق مکان میں نجن نے آٹا چکی لگائی ہے، سارا مکان دن بھر ہلتا رہتا ہے ایک پل چین نہیں پڑتا اور پھر اس کی آواز رات بھر کانوں میں گونجا کرتی ہے۔ ساری رات جاگتے، کھانستے گذر جاتی ہے۔ اب کے گرمیوں کی چھٹیوں میں آکر اس مصیبت سے نجات دلا دو۔ چکی کہیں اور بھی لگ سکتی ہے۔ تالاب کے اس پار میرا دو کمروں کا مکان خالی پڑا ہے۔ اس میں چکی لگا لے۔ میں کرایہ بھی نہ لوں گا۔ بس زندگی کے جتنے دن باقی ہیں چکی کی "پھک پھک" کے بغیر گذر جائیں تو اچھا ہے۔"

اس کے بعد میری بیوی کو دعائیں تھیں، بچوں کو پیار تھا، میری ترقی اور کامیابی پر خوشی کا اظہار تھا۔ لیکن خط ختم کرتے کرتے انھیں کچھ اور یاد آ گیا تھا۔

"اور وہ ننھے ہے نا وہی ننھے جس کا باپ جو کھے کھلیان کی رکھوالی کرتا تھا جسے — اس کے بعد انھوں نے کچھ لکھ کر اس طرح کاٹ دیا تھا کہ میں پڑھ نہ سکوں۔ لیکن جسے میں نے پڑھ لیا تھا — " میں نے دو بار بلوا بھیجا لیکن وہ آیا نہیں۔ اس کا کھیت اب مجھ پر بھاری ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے سینے پر، جو ہر وقت دھونکنی کی طرح پھولتا پچکتا رہتا ہے، کوئی ہل چلا رہا ہے۔ بیٹے وہ آخر اپنا کھیت واپس کیوں نہیں لے

لیتا؟ وہ کھیت واپس لے لے تو میرے سینے پر سے بوجھ ہٹ جائے اور بھپل کی نوک میرے سینے میں نہ چُبھے۔"

اس کے بعد بھی کچھ پیار و محبت کی باتیں تھیں لیکن جملے اکھڑے اکھڑے سے تھے۔ پھر انہوں نے مجھے یاد دلایا تھا۔

"تم ناراض ہو کر چلے گئے تھے۔ بات یہ تھی کہ بی اماں کی سونے کی ہنسلی کھوئی تو ہر کوئی یہی کہتا تھا کہ انہوں نے ہنسلی بڑی بھابی کے پاس رکھائی تھی۔ اس لیے میں نے تمہارا سامان دینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ تو بی اماں کے انتقال کے بہت دنوں بعد معلوم ہوا تھا کہ انھوں نے وہ ہنسلی فروخت کر کے بجریا والی مسجد کا فرش پختہ کرایا تھا اور اس کی دیواروں کی مرمت کرائی تھی۔ اسکے بعد میں نے تم کو کئی خط لکھے۔ تین سال اُدھر جب تم گاؤں آئے تھے تو میں نے کہا بھی تھا کہ اپنا سارا سامان لے جاؤ۔ بھائی صاحب کے انتقال کے بعد جب بڑی بھابھی بھوپال میں عدت کے دن گذار رہی تھیں، میں تمھارے گھر سے ساری گرہستی یہ سوچ کر لے آیا تھا کہ تم یہیں رہو گے پھر جب تم نے الٰہ آباد میں داخلہ لے لیا تھا اور تم اپنا سامان لینے آئے تھے تو میں نے اسے تمھارے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تم اب بھی ناراض ہو۔ کئی سال بعد جب میں نے تم سے سامان لے جانے کے لیے کہا تھا تو تم نے بہانہ کیا تھا کہ لکھنؤ میں تم اس وقت جہاں رہتے تھے، یہ پہاڑ ایسے پلنگ، پانی کی ٹنکیاں، پرانے ڈیزائن کے چینی کے برتن جن پر شوخ رنگ کے پھول بنے ہیں اور لکڑی کے وہ بڑے بڑے بکس جن میں تمھارا سامان اب بھی رکھا ہوا ہے، کہاں رکھو گے کیونکہ تمھارا مکان بہت چھوٹا ہے۔ لیکن میرے بیٹے اب یہ سارا سامان لے بھی جاؤ کہ میں انھیں دیکھتا ہوں تو سانپ بچھو لگتے ہیں۔ اور یہ سانپ بچھو ہر وقت میرے پلنگ کے گرد اگرد گھوما کرتے ہیں۔

اس کے بعد تین چار جملے پھر مجن اور ننھے کے بارے میں تھے۔ پھر آم کے باغ کا قصہ تھا اور اس خود کاشت کا ذکر تھا جو اب بھی ان کے نام تھی اور جسے وہ مجھے دینا چاہتے تھے۔

پھر اس بات کا ذکر تھا کہ زمین داری کے خاتمہ کے وقت معاوضہ کے ۴۴ ہزار کے جو بانڈ ملے تھے اور جب تم ایک ایک پیسے کے محتاج تھے میں ان پر کنڈلی مارے بیٹھا رہا تھا "وہ پیسہ تو جانے کب کا ختم ہو گیا ہے۔۔۔" انھوں نے لکھا تھا لیکن "زمین جائیداد کو تمہارا جو کچھ بھی باقی بچا ہے سب کچھ تمہارے نام لکھ دوں گا ______ لیکن بیٹے اب کی گرمیوں کی چھٹی میں ضرور آؤ، بہو اور بچوں کو بھی لاؤ۔ آنا ضرور۔ تمہاری بات فجّن بھی مان لے گا اور ننھے بھی۔"

پھر بالکل آخر میں لکھا تھا "پچھلے سال آم کی فصل بہت خراب ہوئی تھی۔ اس بار ضرور اچھی ہوگی۔ شہر میں آم کیا خاک ملتے ہوں گے۔ تمہارے باغ کا سا لنگڑا وہاں بھلا کیا خاک ملے گا۔"

میں نے نجو چچا کا خط جو چار پانچ دن پہلے آیا تھا، سات آٹھ بار ضرور پڑھا ہو گا۔ اور سوچا تھا کہ اس بار انھیں جواب ضرور لکھوں گا اور اس بات کا یقین دلاؤں گا کہ وہ سارا سامان جسے رکھنے کے لیے میرے دو کمروں کے مکان میں واقعی جگہ نہیں تھی، ضرور لے آؤں گا۔ (چاہے یہ سارا کھڑاگ وہاں سے لا کر کسی کو دے ہی دینا کیوں نہ پڑے) لیکن . . . .

ماجد چچا اپنے بڑے سے مکان کے باہر جسے گاؤں کے لوگ حویلی کہتے ہیں، ایک لمبے چوڑے تخت پر جس پر دری کے اوپر صاف ستھری چادر بچھی ہے، گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ نیچوان کی نلک ان کے ہاتھ میں ہے۔ آنکھیں ایسی سرخ ہیں کہ کوئی ان پر دو چار بار ہاتھ پیار سے بھی پھیر دے تو خون ٹپک پڑے۔ ترشی ہوئی سیاہ مونچھوں اور گھنے گھنگھریالے سیاہ بالوں نے ان کے سرخ سفید چہرے کو اور بھی رعب دار بنا دیا ہے۔ تخت کے پاس ایک مونڈھا رکھا ہے۔ چاروں طرف کارندے لمبی لمبی لاٹھیاں لیے بیٹھے ہیں۔

ماجد چچا نے ایک لمبا کش لیا، سر کو ذرا سی جنبش دی اور بولے۔

"ہکو ـــــ عیدگاہ پار کے کھیت کا سارا غلّہ کوٹھار پہنچ گیا۔؟"

"ہاں سرکار۔" ہکو نے کام پورا ہونے کی اطلاع بھی ڈرتے ڈرتے دی۔

"اور نجریا کا کھیت؟"

"اس کی فصل بھی کٹ گئی ہے۔" ہکو اب کانپ رہا تھا۔

"لیکن غلّہ ابھی کوٹھار نہیں پہنچا!"

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ہکو نے جس کی آنکھیں زمین پر گڑی تھیں اپنی لاٹھی کی گانٹھ پر ہاتھ پھیرا تو کسی دوسرے کارندے نے دیکھا بھی نہیں کیونکہ ان کی آنکھیں بھی زمین پر گڑی تھیں۔

"میرے سوال کا جواب نہیں دیا تم نے۔" ماجد چچا گرجے۔ ایسا لگا جیسے بجلی کڑکی اور اس کی آواز بار بار بادل سے ٹکراتی رہی۔

رام بھروسے اپنی لاٹھی کی ٹیک لگاکر کھڑا ہوگیا۔ لیکن وہ کانپ رہا تھا اور اس کی لاٹھی جو زمین سے ٹکی تھی دھیرے دھیرے ہل رہی تھی۔

ماجد چچا نے سنک گاؤ تکیہ کے پاس رکھی ہوئی شیشے کی تشتری میں رکھ دی اور رام بھروسے کی طرف دیکھا تو تیل پلائی ہوئی لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی ـــــ لیکن ایسا لگا جیسے کسی نے یہ آواز سنی ہی نہ ہو۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"حجور بیگار میں کیول دو نفر آئے تھے؟"

"ہوں"۔ ماجد چچا نے جیسے غصّہ پینے کی کوشش کی۔

"حجور۔" رام بھروسے نے کانپتی آواز میں کہا۔ "شبّن کو بلانے آدمی بھیجا تھا مگر اس کی ماں نے کہا اسے بخار ہے۔ بیگار نہیں کر پائے گا۔"

"ہوں۔" ماجد چچا کی چھجے دار بھویں ایک دوسرے کے قریب آکر پھڑکیں تو کارندوں میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ یہ ان کے غصّے کی انتہائی شکل تھی۔

"ہجور جب سے ان کے بھائی نے شہر سے روپیہ بھیج کر اسے آٹا چکی لگوادی ہے تب سے وہ بیگار سے کنی کاٹتا ہے۔"

"کل سے چکی کی آواز کانوں میں نہ پڑے۔" انھوں نے سنٹک موہنہ میں لگائی۔ ایک لمبا کش لیا۔ پیر تخت سے نیچے کرنے لگے تو کسی نے دیکھا کہ ایک سلیپر پینیا نے کی طرف ذرا دور کھسک گئی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ذرا آگے بڑھ کر سلیپر پیر کے پاس کر دی۔ ماجد چچا نے ایک بار پھر لٹھیتوں پر نظر ڈالی اور اپنا جملہ دہرایا۔

"کل سے چکی کی آواز کانوں میں نہ پڑے۔"

راتوں رات سارے گاؤں اور آس پاس کی بستیوں میں ڈگی پٹوادی گئی۔ کل سے چکی پر آٹا پسوانے کوئی نہیں جائے گا۔ جس کو آٹا پسوانا ہو اپنا گیہوں چنا لے آئے اور حویلی کے پیچھے پھاٹک سے اتنا ہی آٹا لے لے، پسائی بھی نہیں لی جائے گی۔"

سارے گاؤں پر موت کا سناٹا چھا گیا۔

شبن ڈرتے ڈرتے اپنے کچے مکان سے باہر نکلا۔ چکی بس پچاس ساٹھ قدم کے فاصلے پر تھی۔ راستے میں کئی لوگ ملے۔ اس نے روز کی طرح سلام، بندگی اور رام رام کیا۔ لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ کسی نے اس سے آنکھیں بھی نہ ملائیں، بات چیت کرنا تو دور کی بات۔ چکی پر سناٹا تھا۔ غلّہ کی ایک بھی پوٹلی نہ تھی۔ ترازو کے ایک پلڑے پر بانٹ رکھے اور دوسرے پلڑے کو جو اس کی قسمت کی طرح ہوا میں معلّق تھا وہ دیکھتا رہا۔ لیکن آٹا پسوانے کوئی نہیں آیا۔ پھر جب سورج تالاب کے پاس والے ٹیکرے پر لگے گھنے اور اونچے برگد سے سر نکال کر پورے گاؤں پر پھیل گیا تو اس نے سوچا کہ گھر واپس لوٹ چلے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جوکھے سر پر بڑی سی پوٹلی رکھے آگیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ جوکھے نے پوٹلی زمین پر رکھ دی تو شبن نے اسے دوسرے کی جورو کی طرح دیکھا، للچائی ہوئی نظروں سے لیکن ذرا ڈرتے ڈرتے۔

دونوں خاموش رہے۔

شبّن نے ایک بار پھر لوٹلی کی طرف دیکھا اور کہا:

"آج چکّی نہیں چلے گی۔"

"ڈر گیا۔؟"

"ڈرا نہیں ـــــ لیکن چکّی آج نہیں چلے گی۔"

"دھت تیرے کی ـــــ میں تو تجھے دم دار سمجھتا تھا، تو تو کا پَچو نکلا۔" جوکھے نے کہا۔ اور پوٹلی اٹھالی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو ایک بار پھر دیکھا۔

جوکھے بھی شبّن کی طرح جوان تھا۔ دو چار سال بڑا ہو تو بات دوسری ہے لیکن اس کے بالوں نے بھی ابھی بھبھوت نہیں ملی تھی۔ دو اولادیں تھیں اور دونوں ہی لڑکیاں۔ شبّن اس وقت اپنے سے زیادہ اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میاں اسے نوکری سے نکال دیں گے ممکن ہے گھر بھی پھنکوا دیں۔ کچّی گرہستی ہے۔ کیا کرے گا؟ یہی سب سوچ کر اس نے آٹا پیسنے سے انکار کر دیا تھا۔

لیکن شبّن کے چکّی چلانے نہ چلانے سے کچھ فرق نہ پڑا۔ جوکھے کو نوکری سے نکال دیا گیا اور اس کا چار بسوے کا کھیت جو میاں کے کھلیان سے لگا ہوا تھا، راتوں رات کھلیان میں شامل کر لیا گیا۔

گاؤں میں دو چار دن کچھ تناؤ، کچھ سنّاٹا رہا۔ پھر سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا۔ لیکن چکّی کی پھک پھک اس کے بعد سنائی نہ دی۔ کئی برس تک شہر سے بیل گاڑیوں سے آٹا پس کر آتا رہا اور لوگ حویلی کے پیچھے پھاٹک پر اپنا غلّہ تلوا کر اس کے برابر کا آٹا لے جاتے رہے۔ گاؤں والے خوش تھے۔ دو پیسے پسائی کے بچے۔ ان دو پیسوں کے تیل سے تو دو دن گھر میں روشنی ہو سکتی تھی۔

اس سنانے اور پھر سب کچھ پہلے کی طرح ہو جانے اور ماجد چچا کے خطوں کے درمیان بیس بائیس سال کا فاصلہ تھا۔
ایک ہاتھ میں ٹین کا لوٹا، دوسرے ہاتھ میں لاٹھی، جو اُن کے بڑھاپے کا واحد سہارا تھی۔ یہی
ماجد چچا جواب مجو میاں ہو گئے تھے، مسجد میں داخل ہوتے اور لوٹا مسجد کے فرش پر، جو جگہ جگہ سے چٹخ گیا تھا
رکھ کر لاٹھی ایک کونے میں ٹکا دیتے تو پہلے کی طرح کوئی ان سے اگلی صف میں آنے کے لیے نہ کہتا، وہ آخری
یا اس سے پہلے والی صف میں کھڑے ہو کر اور کبھی بیٹھ کر نماز پڑھ لیتے اور پھر لاٹھی ٹیکتے حویلی لوٹ آتے
جس کے چبوترے کے نیچے کی اینٹیں نہ جانے کب کی غائب ہو چکی تھیں۔ وہ لاٹھی اور لوٹا ذرا آگے جھک کر
باری باری چبوترے پر رکھتے۔ پھر دونوں ہاتھوں سے دیوار کا سہارا لے کر اوپر چڑھتے، کیچڑ بھری آنکھوں
سے چاروں طرف دیکھتے تو ایک لاٹھی زمین پر نہ گرتی۔ کسی کے ہاتھوں پر کپکپی نہ طاری ہوتی۔
ان کا خط اب بھی میرے سامنے رکھا تھا۔ میں نے جواب لکھنا شروع کیا۔

"قبلہ چچا جان۔ سلام خادمانہ۔
آپ کا گرامی نامہ ملا۔ خیریت معلوم ہوئی۔ خدا آپ کا سایہ ہمارے سر پر تادیر قائم رکھے۔
میں اس بار گرمیوں کی چھٹی میں گاؤں ضرور آؤں گا۔ آپ کی قدم بوسی کے لیے۔ آپ کی یہی
خواہش ہے تو سارا سامان بھی اپنے ساتھ لیتا آؤں گا۔"
اس کے بعد میرا قلم رک گیا۔ آگے کیا لکھوں......؟"
اس حکم کے بارے میں کیا لکھوں جس کا کوئی وجود نہیں اور جو کھیے کے بیٹے نتھے کو جس کا
اب دو منزلہ پکا مکان، ٹیوب ویل اور سائیکل کے پرزوں کی بڑی سی دوکان ہے، بھلا کیسے اس پر
آمادہ کرنے کا وعدہ کروں کہ وہ اپنی چار بسوہ زمین واپس لے لے۔ وہ چار بسوے جو ماجد چچا
کے بیٹے اپنے کھلیان کے ساتھ نہ جانے کتنے برس پہلے گروی رکھ کر بھول بھی چکے ہیں۔"

ماجد چچا کا خط میز پر رکھا ہوا ہے۔ میرا آدھا لکھا خط بھی میز پر پڑا ہے۔ یہی کچھ
پہلے دو خطوں کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

▬▬

رشتے

جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی اس نے تکیہ کے دونوں جانب کچھ تلاش کیا۔ وہاں اخبار نہیں تھا۔ اس نے لحاف جو سینے تک سرک گیا تھا کھینچ کر ناک کے پاس تک کر لیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر تک اس فقیر کی آواز کا انتظار کرتے کرتے جس سے رات کی ڈیوٹی کرنے کے بعد اکثر بہت سویرے ہی اس کی آنکھ کھل جاتی تھی نہ جانے کب سو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلنے پر اس نے اخبار پر نظر ڈالی ہی تھی اور ابھی سرخیاں ہی پڑھ رہا تھا کہ اس کی بیوی نے دروازہ سے جھانک کر کہا۔

"اٹھ گئے۔" میں نے ساری کھڑکیاں بند کر کے پردوں پر ایک ایک چادر ڈال دی تھی۔ جانتے ہیں کیا بجا ہے۔ ساڑھے نو، میں ابھی چائے لائی۔"

اس نے چائے کا مگ ختم کرتے کرتے اخبار کا پہلا صفحہ تقریباً پڑھ ڈالا اور اندر کے صفحات کی اہم خبروں پر بھی نظر ڈال لی۔

"کوئی خاص خبر؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

"دو سیاسی لیڈروں کا انتقال، ایک ریل کا حادثہ، بس کھڈ میں گرنے سے نو آدمیوں کی موت" اس نے لحاف سے خود کو آزاد کرتے ہوئے کہا اور تقریباً اچھل کر مسہری کے سرہانے کی جانب سے فرش پر آ رہا۔ ایک چپل سامنے ہی تھی، دوسری شاید کسی کے پیر کی ٹھوکر

سے اِدھر اُدھر ہوگئی تھی۔ اس نے جھک کر مسہری کے نیچے سے چپل نکالی۔ ہینگر پر سے گاؤن اتار کر اس میں جلدی جلدی ہاتھ ڈالے اور سیٹر پیٹر کرتا ہوا باتھ روم کی طرف چلا گیا۔

سراج کی اس بھاگم بھاگ میں اس کی بیوی کو یہ کہنے کا موقعہ ہی نہیں ملا کہ اس کا خالہ زاد بھائی، ہائے کیسا گبرو جوان تھا، شادی کے کچھ ہی دنوں کے بعد ریل کے ایک حادثہ میں مارا گیا تھا۔ سراج بھی شاید جانتا تھا کہ اس نے بیوی کو سانس بھی لینے کی مہلت دی تو وہ یہ کہانی ضرور دہرائے گی۔ جب بھی ریل کے کسی حادثہ کی خبر آتی وہ اپنے مرحوم خالہ زاد بھائی کا ذکر ضرور کرتی۔

باورچی خانہ میں ناشتہ تیار کرتی ہوئی بیوی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے وہ کمرہ میں آگیا۔ اس کی بیوی نے کمرہ کی ساری کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ پردے کھینچ کر کونوں میں کردیے تھے۔ اور کمرہ میں دھوپ بھر گئی تھی۔ اس نے جھک کر باہر سڑک کی طرف دیکھا۔ بائیں جانب سڑک کے کنارے جہاں وہ فقیر بیٹھتا تھا، اب خالی پڑی تھی۔ اس نے اطمینان کی سانس لی اور آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ اتنے میں بیوی نے میز پر ناشتہ لگا دیا۔ تو اس نے اپنے آپ ہی کہا۔

"ریل کے حادثہ میں کوئی موت نہیں ہوئی۔"

"اور دو سیاسی لیڈر؟"

"ان میں سے ایک لوک سبھا کا سابق ممبر تھا اور دوسرا سابق وزیر۔" اس نے کہا "دونوں ہی کی موت کینسر سے ہوئی ہے۔ اس بیماری سے کوئی نہیں بچ پاتا۔"

"کون سی بیماری سے کوئی بچ جاتا ہے۔" اس کی بیوی نے کہا تو اسے حلق میں نوالہ پھنستا ہوا محسوس ہوا۔

اس نے جلدی سے چائے کا گھونٹ لیا اور موضوع بدل دیا۔

"آنکھ تو بہت پہلے ہی کھل گئی تھی اس فقیر کی آواز سے لیکن پھر نیند آگئی۔"

"پوری نیند سو لیا کیجیے ـــــ میں نے باہر کا دروازہ بھی کھول دیا تھا کہ اخبار والے کے زنجیر کھٹکھٹانے سے کہیں آپ کی نیند نہ کھل جائے ـ"

"لیکن اس کی آواز ہے بڑی کڑک دار ـ"

وہ موہنہ اندھیرے اکبری گیٹ کی طرف سے آتا ـ اپنے تھیلے سے ٹاٹ کا ایک ٹکڑا نکال کر اس سے زمین صاف کرتا پھر دونوں ہاتھوں سے ٹاٹ کے اس ٹکڑے کو ہوا میں لہرا کر اس کی گرد جھاڑتا اور اسے زمین پر بچھا دیتا ـ پھر تھیلے سے ایک پرانا کپڑا نکال کر جس کا رنگ شاید کبھی نیلا رہا ہوگا اس ٹاٹ پر بچھاتا ـ تھیلا کندھے پر سے اتار کر زمین پر رکھتا ' اس میں سے ایک کٹورا نکال کر اپنے سامنے سجاتا اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا ـ بیٹھ کے آگے کی طرف کندھوں پر پڑا لال انگوچھا دونوں کونوں سے پکڑ کر دھیرے دھیرے آگے کی طرف کھینچ کر برابر کرتا ـ کٹورے کو ایک بار پھر اِدھر اُدھر کھسکاتا ـ ایک بار پھر ٹاٹ کے کونوں اور اس پر بچھے ہوئے کپڑے پر ہاتھ پھیرتا کہ اس پر ایک بھی شکن نہ رہ جائے اور آواز لگاتا ـ

" اللہ کے نام پہ ـــــ "

اس مکان میں آنے کے بعد پہلی صبح بہت سویرے اس کی آنکھ اسی آواز سے کھلی تھی اور یہ ایک ناگوار تجربہ تھا ـ

تھوڑی دیر تک سونے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد کچھ تو اس ناگوار تجربہ کا اثر زائل کرنے اور کچھ نئے مکان کے جغرافیہ سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے وہ زینہ سے اتر کر سڑک کے کنارے والی دوکان کے چبوترے پر آ کھڑا ہوا تھا ـ

نیا مکان بہت اچھا تھا ـ صبح کی پہلی کرن دوسرے سارے مکانوں کو چھوڑ کر سب سے پہلے وہیں آتی تھی ' ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اسی مکان سے ہو کر ساری دنیا تو نہیں کم سے کم سارے شہر میں ضرور پھیلتا تھا ـ دو بڑے بڑے کمرے ' ایک برآمدہ ' کشادہ آنگن ' دو میاں بیوی ' ایک بچے کیلیے

سکانی بلکہ کافی سے بھی زائد تھے ۔

اس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے فقیر کی طرف کچھ غصہ، کچھ نفرت، کچھ حقارت اور کچھ اس خواہش کے ساتھ دیکھا کہ اگر اس کی آواز جڑی نہ ہوتی تو مکان اور بھی اچھا ہوتا ۔

اس کے سامنے پھیلی ہوئی سڑک جو ایک طرف بڑے بڑے پارکوں، دریا، تاریخی عمارتوں اور نیم آباد بستیوں سے اور دوسری طرف گنجان آبادیوں سے جڑی تھی، اب جاگ گئی تھی۔ صبح سیر کر کے واپس آتے والوں میں ایک شخص نے اس کے کٹورے میں سکہ ڈالا تو اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر کٹورے کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ کٹورے کے اندر کئی سکے تھے۔ اسی لمحہ فقیر نے کٹورا اٹھایا، اِدھر اُدھر دیکھا اور کسی کو آس پاس نہ پاکر سارے پیسے ہاتھ میں اُلٹ کر جھولے میں ڈال لیے اور آواز لگائی ۔

" اللہ کے نام پہ ۔"

وہ مسکرایا، لیکن اس کی مسکراہٹ میں کچھ کچھ غصہ بھی شامل تھا۔

وہ سڑک سے واپس آیا تو اس کی بیوی انتظار کر رہی تھی اسے دیکھتے ہی بولی ۔

" آپ کو بستر پر نہ پاکر میں تو پریشان ہو گئی تھی، پھر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو آپ سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ جلدی سے دانت صاف کر لیجیے، چائے تیار ہے ۔"

غسل خانے جاتے ہوئے اسے جانے کیا سوجھی کہ اس نے باتھ روم کے فلش کی زنجیر کھینچ دی پانی چھل چھل کرتا بہنے لگا اور وہ اس ڈوبتی ہوئی آواز کو سننے لگا۔ وہ جس مکان سے یہاں منتقل ہوا تھا اس میں فلش نہیں تھا۔

کیتلی سے چائے انڈیلتے ہوئے اس کی بیوی نے کہا ۔

" ابھی تو جلدی میں سامان یوں ہی رکھ دیا ہے ۔ جب قاعدے سے ساری چیزیں سجاؤں گی تو مکان بہت اچھا لگے گا۔"

"ہوں۔" اس نے کہا اور کمرہ پر پسندیدگی کی نظر ڈالی۔

کمرہ میں کئی الماریاں تھیں۔ سڑک کی جانب کھلنے والی چار بڑی بڑی کھڑکیاں اور دوسرے کمرہ سے ملانے والا بڑا سا دروازہ اور خاصی اونچی چھت۔

وہ چھت کی بلندی آنکھوں ہی آنکھوں میں ناپنے کے لیے نظریں اوپر اٹھا کر کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ فقیر کی آواز "اللہ کے نام پر" اور کٹورے میں سکّہ کے گرنے کی آواز ایک ساتھ ہی سنائی دیں۔ شاید کسی نے خاصی اونچائی سے سکّہ اس کے کٹورے میں ڈالا تھا۔

تین چار دنوں میں ان دونوں نے مل کر سارا سامان قرینے سے سجا دیا۔ ویسے ایسا کوئی زیادہ سامان تھا بھی نہیں۔ دو مسہریاں، ایک دو چھوٹے بڑے پلنگ، کپڑوں کے چند بکس، معمولی سا فرنیچر اور دو چار کتابیں۔ بائیں جانب کی کھڑکی کے پاس کا کونہ اس کی بیوی نے، وہ آرام کرسی ڈالنے کے لیے جو سراج کے والد کی یادگار تھی، منتخب کی اور کہا۔

"یہاں کھڑکی پر گلاب کا ایک گملا رکھ دوں گی۔ آپ صبح اسی کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر آرام سے اخبار پڑھا کیجیے گا۔ میں اُدھر" دوسری طرف اشارہ کیا "چھوٹی تپائی رکھ دوں گی۔ آپ کی سگریٹ کی ڈبیا، دیا سلائی، ایش ٹرے اسی پر رکھی رہیں گی۔ چائے پیتے وقت پیالی بھی اسی پر رکھ لیا کیجیے گا۔ ورنہ ہاتھ میں لیے رہتے ہیں اور جلدی سے چائے ختم کرنے کے چکّر میں مونہہ جلا لیتے ہیں۔"

ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں ریحانہ کی یہ دلچسپی اسے پسند آئی۔ اس نے کھڑکی کے قریب جا کر باہر جھانکا، وہاں کوئی نہ تھا اور جس جگہ وہ فقیر بیٹھا تھا وہاں ایک موٹر کھڑی تھی لیکن اس کی کڑک دار آواز "اللہ کے نام پر" جیسے اس کے کانوں سے ٹکرائی اور اس نے کہا۔

"یہ جگہ تو بالکل سامنے ہی ہے۔ اس کی آواز سیدھی یہاں آئے گی۔ آرام کرسی" وہاں" اس نے کمرے کے دوسرے کنارے کی آخری کھڑکی کی طرف اشارہ کیا "اس جگہ ڈال دی جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔"

کرسی اس کونے کے بجائے اس کونے میں ڈالی گئی تو مسہریوں، بڑی میز، ریڈیو، سنگار میز

غرض ہر چیز کی جگہ بدل گئی اور کمرہ بالکل دوسرا ہی لگنے لگا۔

چند دنوں بعد دونوں نے ایک نہایت خوبصورت ڈائننگ سیٹ بھی خرید لیا جسے دوسرے کمرہ میں جس میں ایک تخت، ایک معمولی سا صوفہ سیٹ، سینٹر ٹیبل، ایک بیڈ اور ایک الماری پہلے ہی سے رکھی تھیں، ان دونوں نے جگہ جگہ رکھ کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس کے لیے کون سی جگہ مناسب رہے گی۔ اس میں پورا دن لگ گیا۔

اس نے کئی بار کسی نہ کسی بہانے اس کمرہ میں جاکر چیزوں کی نئی ترتیب اور خاص طور پر ڈائننگ ٹیبل کا معائنہ کیا۔ پھر شام ہوئی تو دن بھر کی تکان کے سبب جلدی سے کھانا کھا کر وہ دونوں لیٹ گئے۔ ریڈیو سے خبریں ختم ہوئیں تو وہ بستر سے اٹھا، کھڑکی پر کھڑے ہو کر اس نے دو چار لمبے لمبے سانس لیے۔ اور برآمدہ میں آکر دھیرے دھیرے دوسرے کمرہ کا دروازہ کھولا، چپکے سے بجلی جلائی، جیسے اُسے ڈر ہو کہ اس کمرہ میں بجلی جلنے کا کسی کو علم ہو گیا تو وہ اس کے دل کا چور پکڑ لے گا۔ چیزوں کی ترتیب پر فخریہ نظر ڈالی اور بجلی بجھاتے بجھاتے ڈائننگ ٹیبل پر جس کی سن مائکا روشنی میں اور بھی چمک رہی تھی، دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرا اور سن مائکا کے پھولوں کی خوشبو اور رنگوں کا احساس اپنی ناک اور آنکھوں میں لیے دوسرے کمرہ میں آگیا۔

"کہاں گئے تھے؟"

"کہیں نہیں۔"

ریحانہ نے کچھ اور نہ پوچھا اگر وہ کچھ اور پوچھتی تو اسے کم سے کم اس بات کا یقین تو دلاتا ہی کہ وہ ڈائننگ ٹیبل دیکھنے اس کمرہ میں نہیں گیا تھا۔ کوئی بھی بہانہ کر دیتا۔ لیکن جب اس نے پوچھا ہی نہیں تو وہ اپنی صفائی کیسے دے۔

"کیا سو گئے۔؟" تھوڑی دیر بعد ریحانہ نے آہستہ سے پوچھا۔

"نہیں تو۔"

"اپنے دوستوں کو کب بلائیے گا؟"

"جب کہو۔"

"آپ کا آف پرسوں ہے نا؟"

"ہاں تو بلا لیجیے ـــــ رات کے کھانے پر۔"

اس کے بعد دونوں بہت دیر تک دعوت کے انتظام کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ پہلے تو یہ طے کیا گیا کہ کس کس کو بلایا جائے۔ اس کے دوستوں میں دو تین شادی شدہ تھے۔ چنانچہ ان کی بیویوں کو بھی مدعو کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

"تم اپنی سہیلیوں کو بھی کیوں نہیں بلالیتیں ؟ بار بار پریشان ہونے سے فائدہ۔" اس نے کہا تو اس کی بیوی نے اپنی قریبی سہیلیوں کے نام گنائے۔ جب چار سہیلیوں کے نام گنا کر اس نے کہا 'بس' تو سرج نے کہا۔

"کوئی رہ تو نہیں گیا ؟"

"ایسا تو کوئی رہ نہیں گیا جسے بلانا ضروری ہو۔"

"اور شیلا ؟"

"ارے اس کا نام تو میں بھول ہی گئی تھی۔ لیکن کیا بات ہے آپ شیلا میں بہت دلچسپی دکھا رہے ہیں۔ کیا پسند آگئی ہے ؟"

ایک زور دار قہقہہ بلند ہوا جس میں تھوڑی دیر بعد وہ بھی شامل ہو گئی۔ اسی وقت نہایت تیز ہارن بجاتا ہوا ایک ٹرک سڑک پر سے گذرا تو اس کی ہلکی ہلکی روشنی کمرہ میں پھیل گئی اور دونوں کی نظر شاید ایک ہی ساتھ گھڑی پر پڑی۔ پونے بارہ بجے تھے۔

"اچھا اب سو جائیں۔ پونے بارہ بج گئے، صبح سویرے ہی ـــــ"

اس نے جملہ مکمل نہیں کیا لیکن دونوں ہی کو علم تھا کہ مکمل ہونے پر اس جملہ کا مدت کون بنے گا۔

ادریس بے حد جوش میں تھا۔ اپنی بات منوانے کے لیے اس نے اپنی آواز بھی اونچی

کرلی تھی ۔

"جی نہیں یہ غلط ہے ۔" اس نے شیکھر کی دلیل کاٹی " ہم لوگ بنیادی طور پر کاہل ہیں آٹھ بجا نہیں کہ جماہیاں لینا شروع کردیں ۔ صبح دیر سے سو کر اٹھے ۔ ذرا سا کام کیا اور تھک کر پلنگ پر دراز ہو گئے ۔ یورپ کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ کس طرح کام کرتے ہیں ۔"

"دیکھا ہے ۔" شیکھر نے جو ایک بار اپنے بھائی کی دعوت پر لندن ہو آیا تھا کہا " ہفتہ میں دو دن ــــ سنیچر اتوار ــــ تو کام کی طرف پلٹ کر دیکھتے بھی نہیں ۔"

"اور یہ نہیں دیکھا کہ پانچ دن کس طرح کام کرتے ہیں ۔"

شیکھر جواب کی تلاش ہی میں تھا کہ بلراج نے اس کی مشکل آسان کردی ۔

" میں نے ہسٹری پڑھی ہے ۔ میں جانتا ہوں یہاں کے عام لوگ کبھی خوشحال نہیں رہے ۔ اور وجہ وہی ہے جو میں ہمیشہ بتاتا ہوں ــــ گرمیوں میں بے حد گرمی، جاڑوں میں بے حد جاڑا اور برسات میں بے حد بارش ــــ کوئی کام کرے بھی تو کب کرے ۔" اس نے کہا اور شیکھر کے چہرہ پر پھیلتی ہوئی مسکراہٹ دیکھ کر بولا ۔ " جناب یہ بات میں نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں ــــ ہمارے ملک کے قصّے کہانیوں میں فقیروں کے جتنے واقعات اور کیریکٹر ملتے ہیں، دنیا کے کسی ملک کی کہانیوں میں نہیں ملیں گے ۔"

" اب آئے ہیں آپ مسئلہ کے اصل پہلو پر ۔" عثمان نے جو اب تک ساری بحث میں خاموش بیٹھا رہا تھا کہا " ہمارے قصّے کہانیوں میں فقیروں کی بھرمار اس بات کی علامت ہے کہ یہاں کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خود محنت کیے بغیر، دوسروں کی محنت کے بل بوتے پر زندگی گذاری جاسکتی ہے اصل میں یہی رویہ ذمہ دار ہے ہماری غربت کا ۔"

ملک کی ترقی کی دھیمی رفتار کی بحث جب فقیروں پر آکر رکتی ہوئی معلوم ہوئی تو میاں بیوی نے ایک دوسرے کو دیکھا ۔

ان دونوں کے درمیان ایک کرخت آواز ہوا میں معلق تھی ۔

مہمانوں کو رخصت کر کے جب وہ دونوں اپنے کمرہ میں دعوت کی کامیابی کا جائزہ لینے بیٹھے تو سراج نے کہا۔ " بھائی تم تو بہت اچھا کھانا پکانے لگی ہو۔"

" عثمان تو بہت تعریف کر رہے تھے۔"

" سب کو پسند آیا۔" سراج نے کہا۔

"شام بڑی دلچسپ گذری۔ لیکن یہ آپ لوگ ہر چیز کو اتنی سنجیدگی سے کیوں لیتے ہیں؟"

" کیوں، کیا ہوا؟"

" اسے آپ کی بحث سے کیا ملک کی غربت دور ہو جائے گی ۔۔۔ جانتے ہیں آپ لوگوں نے کتنی دیر تک بحث کی ہے۔ پورے دو گھنٹے اور اتنے زور زور سے کہ محلّہ والے سوچ رہے ہوں گے کہ لڑائی ہو رہی ہے۔"

"ہم لوگ بحث ہی تو کرتے ہیں۔"

وہ سراج کی بات سمجھی نہیں اور بولی۔

"لیکن کوئی حد بھی ہوتی ہے اور آخر میں تو میں ڈر سی گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ ان کو معلوم تو نہیں ہو گیا ہے۔"

سراج کچھ نہ بولا۔

" بس وہ نہ ہوتا تو یہ مکان بالکل بے عیب تھا۔"

" میں نے تو اسی وقت کہا تھا کہ سامنے والا فلیٹ لے لو۔ اس میں ایک کمرہ بھی زیادہ تھا اور سڑک سے ذرا فاصلہ پر بھی تھا۔ کرایہ بیس ہی روپے تو زیادہ تھا۔"

" لیکن مجھے کیا معلوم تھا۔"

وہ شاید کچھ اور کہتی لیکن اسی وقت نسرین بستر میں کنمنائی اور وہ اسے تھپکی دے کر سلانے لگی۔

زینب بے حد گرم تھا۔ اس نے دوسری بار زور سے دروازہ بھڑ بھڑایا تو "آتی ہوں" کہتی

ہوئی وہ بھاگی اور دروازہ کھولا تو سراج کو پسینہ میں شرابور کھڑا پایا اور بے حد نڈھال بھی۔

"کیا دروازہ کھولنے میں زیادہ دیر لگ گئی، ایک ہی بار تو آپ نے کھٹکھٹایا تھا۔"

"دوبار۔"

کمرہ میں داخل ہوتے ہی ریحانہ نے پنکھے کی رفتار تیز کردی۔ پسینے سے بھیگے ہوئے جسم پر گرم ہوا بھی اچھی لگی لیکن پسینہ خشک ہوگیا تو اسے پنکھے سے لُو نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے منہ پر پانی کے دو چھینٹے مارے اور چائے کا انتظار کرنے لگا۔

"بے حد گرمی ہے۔ آج آپ کو دیر بھی ہوگئی۔"

"ہوں۔"

"کیا بہت کام تھا دفتر میں؟"

"نہیں تو ــــ بس میں ایک حادثہ ہوگیا۔"

"کیا ہوا ــــ کوئی بس کے نیچے آگیا کیا۔ مرا تو نہیں؟"

"مرگیا۔"

"ہائے کون تھا وہ؟"

"بس کے نیچے آکر نہیں۔ بس میں ہی۔"

"بس میں؟"

"سٹی اسٹیشن سے بس چلی ہی تھی کہ بڈھا سا آدمی جو اپنے سامنے والی سیٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے کھڑا تھا یوں گر پڑا جیسے دیوار کے سہارے کھڑی کی گئی سوکھی لکڑی ہوا کے ایک جھونکے سے گر جائے ــــ بس فوراً روک دی گئی۔ کنڈکٹر نے کہا جسے اترنا ہے اتر جائے بس سیدھے کوتوالی جائے گی۔ کسی نے کہا، راستہ میں جو اسٹاپ پڑیں ان پر مسافروں کو اتارتے چلنا۔ ایک صاحب بولے، مجھے جلدی ہے۔ تمام کی گاڑی سے پیلی بھیت جانا ہے۔ پہلے بس کو ہٹا کر گنج کے اڈّے تک لے چلو، وہاں سے تھانے چلے جانا۔ غرض لوگ اپنی اپنی کہہ رہے تھے کہ

ڈرائیور نے ایک دم بس اسٹارٹ کر کے سیدھے کوتوالی میں جا کر کھڑی کر دی۔ وہ تو میں کھسک آیا ورنہ بیان گواہی کے چکر میں پھنس جاتا تو اور دیر لگتی۔"

"کچھ پتہ چلا کون تھا؟"

"ٹھیک سے معلوم نہ ہو سکا۔ میلے سے کرتے کے نیچے صدری میں سو سو کے کئی نوٹ تھے۔ اوپر کی جیب میں کچھ روپے اور ریز گاری تھی۔

"معلوم نہیں کون تھا بے چارہ، ہوا کیا تھا اسے؟"

"شاید فقیر تھا۔" اس نے سوال کے دوسرے حصّہ کو نظر انداز کر دیا۔

"فقیر تھا! ـــــ یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"بس اندازہ ہے۔"

اسی لمحہ وہ کرسی پر سے اٹھی اور یہ دیکھنے کے لیے کہ باہر سڑک پر اب بھی لو کے تھپیڑے چل رہے ہیں یا نہیں، اس نے کھڑکی تھوڑی سی کھول کر باہر جھانکنے کی کوشش کی تو سراج بولا۔

"وہاں کیا دیکھ رہی ہو۔ وہ ہم لوگوں والا فقیر نہیں تھا ـــ دیکھ لینا کل صبح پھر ـــ"

"مجھے تو اب سچ مچ بڑا غصہ آتا ہے۔" ریحانہ نے کھڑکی بند کی۔ "کل ترکاری والے نے اس کی چادر پر ترکاری رکھتے ہوئے جب کہا کہ بابا اب ہم اچھے ہو گئے ہیں اور کل سے ٹھیلا لگا رہے ہیں گے تو معلوم ہے اس نے کیا کہا تھا۔" اس نے سراج سے پوچھا لیکن جواب کا انتظار کیے بغیر بولی "اس نے کہا میں نے دعا کی تھی۔" جیسے ترکاری والے بابا اسی کی دعا سے تو اچھے ہوئے ہوں۔ ایسے ہی پہنچے ہوئے ہوتے تو سڑک کے کنارے بیٹھ کر ہر آنے جانے والے کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاتے۔"

دونوں کے دل اب بس والے واقعہ پر افسوس کے بجائے نفرت اور غصّے سے بھرے تھے۔ یہ بادل شاید پوری رات کی نیند کے بعد ہی چھٹے ہوں گے۔

اسے سینما دیکھنے سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے ایک دن جب دفتر سے واپسی پر اس نے جیب سے دو ٹکٹ نکال کر میز پر رکھ دیے تو ریحانہ کو بے حد حیرت ہوئی۔

"آج کدھر سے چاند نکلا ہے؟" اس نے کہا۔

"دفتر میں سب تعریف کر رہے تھے تو میں نے بھی ٹکٹ خرید لیے۔"

"کس شو کے ہیں؟"

"نو سے بارہ ——— سوچا شام کے شو کا لوں گا تو بھاگم بھاگ دفتر سے واپس آنا پڑے گا.
اب تم بھی آرام سے تیار ہو جاؤ گی اور میں بھی ذرا سستا لوں گا۔"

وہ ذرا سی دیر میں چائے بنا کر لائی اور دونوں چائے پینے لگے۔ نسرین پاس کے کسی گھر میں بچوں کے ساتھ کھیلنے گئی تھی۔

تھوڑی دیر تک وہ دونوں اس فلم کے ایکٹروں، کہانی کار اور پروڈیوسر کے بارے میں باتیں کرتے رہے، باتیں کرتے کرتے اسے اپنی سیاسی زندگی کے ایک ساتھی کی یاد آ گئی جو فلموں میں ایک بار جھلک دکھا کر جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

"تم نے پرنیتا دیکھی ہے نا؟"

"آپ اپنے دوست تنویر کا ذکر کر رہے ہیں۔؟"

اسے یاد آیا کہ وہ ریحانہ سے اس فلم کا ذکر کئی بار کر چکا ہے۔

"ہاں، بڑی عمدہ ایکٹنگ کی تھی اس نے۔ چھوٹا سا رول تھا، فقیر کا لیکن یاد رہ جاتا ہے۔"

لفظ فقیر پر ریحانہ کو جیسے ایک دم کوئی بات یاد آ گئی۔ بولی۔

"کچھ سنا آپ نے۔ وہ فقیر جو سامنے بیٹھتا تھا، وہ پرسوں مر گیا۔"

"پرسوں۔"

"ہاں پرسوں ——— بوا نے آج ہی بتایا۔ انہی کے محلے میں تو رہتا تھا۔"

"لیکن میں نے تو آج ہی صبح اس کی آواز سنی تھی۔"

"آج صبح! ——— وہ تو سات آٹھ دن سے بہت بیمار تھا۔ اس درمیان آیا بھی نہیں۔
آپ کو دھوکا ہوا ہو گا۔"

www.taemeernews.com

سراج کچھ نہ بولا۔ دونوں گردن جھکائے اپنی اپنی پیالیوں کو دیکھتے رہے۔ دونوں نے باری باری اس خاموشی اور سناٹے کو اپنے اپنے طور پر توڑنے کی کوشش کی۔ لیکن انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ سراج نے پیالی کے نچلے حصے پر یہ معلوم کرنے کے لیے ہاتھ پھیرا کہ چائے گرم ہے یا نہیں۔ لیکن کوئی اندازہ نہ کر سکا۔ تو اس نے پیالی موہنہ سے لگائی۔ چائے شاید بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس نے پیالی میز پر رکھ دی اور کچھ کہے بغیر دوسرے کمرہ میں جاکر کوئی رسالہ پڑھنے لگا۔

کافی دیر کے بعد شاید سگریٹ کی ڈبیا کی تلاش میں وہ سونے کے کمرے میں گیا تو بجا نہ پرانے کپڑوں کی مرمت کر رہی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے نو بجا تھا۔

--

دشتِ تعلّق

پھول کی پتّی سے ہیرے کا جگر کیسے کٹ سکتا ہے یہ کوئی ابراہیم سے پوچھے جس کے ساتھ اسکول کے پاس والے کھاڑ کھوڑ میدان میں ایک لاوارث قبر کے قریب گلاب کے ایک پودے سے بے رحمی کے ساتھ توڑے ہوئے پھول کو دیکھ کر جس کی پنکھڑیاں اب بھی کٹورے میں لگی ہوئی تھیں اور تر و تازہ تھیں ہم دونوں نے تقریباً ایک ساتھ یہ مصرعہ پڑھا تھا ؎

کیا خطا تھی میری ظالم تو نے کیوں توڑا مجھے

ہم دونوں نے گلاب کی ان پنکھڑیوں پر جو اب بھی کٹوری میں لگی ہوئی تھیں پیار سے انگلیاں پھیری تھیں۔ ان دو تین پنکھڑیوں کو جو زمین پر بکھری گئی تھیں، لیکن تھیں اب بھی تر و تازہ، محبت بھری چٹکیوں سے اٹھا کر پنکھڑیوں کے ساتھ سجانے کی کوشش کی تھی۔ اس شخص کو جس نے یہ پھول اس قدر بے رحمی سے توڑا تھا کوسا کاٹا تھا اور روئے تھے۔ پھول کے توڑے جانے پر نہیں بلکہ اس طرح توڑے جانے پر کہ اس کا وجود بکھر کر رہ گیا تھا۔

ہماری دوستی کا سارے اسکول میں چرچا تھا۔ ابراہیم کہاں ہوگا؟ وہاں جہاں میں ہونگا۔ میں کہاں ہونگا وہاں جہاں ابراہیم ہوگا! —— ہم اسکول میں تقریباً سارے وقت ساتھ ساتھ رہتے، جانے کیا کیا باتیں کرتے۔ ایک ساتھ پڑھائی بھی کرتے تھے یا نہیں یہ اب یاد نہیں۔

پھر میرے والدین کو جانے کیا سوجھی کہ مجھے تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھوپال بھیج دیا گیا۔ اسٹیشن پر چند رشتہ داروں، والد کے چپراسی بالا دین اور کچھ دوسرے لوگوں کے علاوہ جو شخص مجھے الوداع کہنے آیا تھا وہ ابراہیم تھا اور جب گاڑی نے رینگنا شروع کیا تھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ میں بھی آنسو بھرے کھڑکی کے پاس بیٹھا، گردن باہر نکالے ابراہیم اور صرف ابراہیم کو دیکھتا رہا تھا، یہاں تک کہ گاڑی نے موڑ لیا اور پلیٹ فارم آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ والدہ نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کرنے لگیں۔ لیکن میرے آنسو نہ تھمے اور پھر میں روتے روتے نہ جانے کب سو گیا۔

دس سال بعد جب میں بھوپال سے بھاگ کر منماڑ، بمبئی اور اورنگ آباد ہوتا ہوا اورئی پہنچا اور اسٹیشن کے باہر سندر تانگے والے نے مجھے دیکھتے ہی اپنی سواریاں اتار دیں اور گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے میونسپل ہال کی طرف اڑا تو تانگہ اتھائی کی طرف جا رہا تھا اور میرا دل بالکل دوسری طرف۔ ابراہیم کے گھر کی جانب۔ آگے تراہے کے پاس جب تانگہ بائیں طرف مڑا تو جنوری کے پہلے ہفتہ کی اس صبح میں جب کہرا بری طرح چھایا ہوا تھا میری آنکھوں نے ابراہیم کا گھر تلاش کر ہی لیا۔ لیکن وہ گھر آنکھوں نے نہیں، دل نے دیکھا تھا۔

ساٹھیا کنوؤں، دو ہائی اسکولوں، ٹین کے ایک سنیما گھر اور چھوٹے سے بازار کے اس شہر کی کچہری میں پیشکار کا بیٹا جس کے بارے میں اس کے والدین کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ اسے عزیزوں نے قتل کر کے کہیں گاڑ دیا ہے، یوں اچانک واپس آجائے تو یہ ایک واقعہ تو ہوا ہی۔ تھوڑی ہی دیر میں لوگ آنے لگے۔ پہلے محلے والے آئے، پھر رشتہ دار، پھر وہ جن سے گہرے تعلقات تھے اور میں ان کے درمیان گھرا بیٹھا رہا ـــــــ اور وہی ایک کہانی جس میں کچھ سچ تھا کچھ جھوٹ، کچھ عزت تھی کچھ عزت کو بچانے کی کوشش، سنتے سنتے تنگ آگیا تو چپکے سے اٹھا۔ ہونٹوں کو جنبش دیے بغیر آنکھوں سے کہا "ابھی آتا ہوں ـــــــ" اور پھر میں وہاں نہیں تھا۔

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد جب میں اور ابراہیم اسی کھابڑ اور کھوبڑ میدان میں ایک پتھر پہ بیٹھے نہ جانے کیا کیا باتیں کر رہے تھے کہ لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ ابراہیم کے ساتھ ملے گا" ___ مجھے ڈھونڈنے والوں میں سے کسی نے کہا تھا۔

اور پھر یہ دو سال درمیاں سے اس طرح غائب ہو گئے جیسے کبھی آئے ہی نہ ہوں۔

لیکن کچھ دنوں بعد ___

"کل شام میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔" ابراہیم نے کہا۔

"ہاکی کھیلنے چلا گیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

پھر چند مہینوں بعد ___

"یہ بھورے رنگ کا کوٹ تم نے کیوں بنوایا؟" میں نے ابراہیم سے کہا۔ "تمہارے سُرخ سپید چہرے پر تو کوئی شوخ رنگ کھلتا۔"

"ابو کو تو لال دھاری کا کپڑا پسند تھا لیکن مجھے یہی اچھا لگا۔" اس نے جواب دیا۔

پھر ایک دن وہ تار آیا جس نے زندگی کا سارا منظر ہی بدل دیا۔

"تمہارے والد کی طبیعت بہت خراب ہے۔ فوراً آؤ۔"

یہ تار اس وقت دیا گیا تھا جب ان کی آخری رسوم بھی ادا کی جا چکی تھیں۔

میں بلکہ ہم سب لوگ لکھنؤ چلے آئے اور زندگی کی اس منزل میں داخل ہو گئے جہاں اپنی تو کیا ابراہیم کی بھی یاد نہیں آئی۔

دس بارہ سال بعد کرسچین کالج کے سامنے والی سڑک کی دوسری طرف ایک سائیکل سوار پر نظریں ٹک گئیں۔ جی چاہا کہ کھڑکی سے پھاند پڑوں لیکن بس کی رفتار بہت تیز تھی۔ میں

اپنی سیٹ میں پھڑ پھڑا کے رہ گیا۔

سائیکل سوار ابراہیم کے بڑے بھائی تھے۔

بس جب تک چوک تک پہنچ نہ گئی میں ابراہیم ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیا وہ بھی اسی شہر میں ہے؟ لیکن کبھی نظر تو آیا ہوتا۔ شاید ایک بار کسی کو دیکھ کر ابراہیم کا شبہ ہوا بھی تھا لیکن بس ایک جھلک دیکھی تھی۔ ممکن ہے وہی رہا ہو۔ یا پھر کوئی اور ہو ــــ بچپن کی یادیں بہت سی دوسری یادوں کے ساتھ گڈمڈ ہو جاتیں لیکن ان کا خاتمہ کسی نہ کسی ایسے واقعہ سے ہوتا جس میں ابراہیم ضرور شامل رہتا۔

میں بس سے اترا۔ اس وقت بھی ابراہیم اپنی یاد کی شکل میں میرے ساتھ تھا لیکن پھر سڑک کی بھیڑ بھاڑ میں وہ نہ جانے کہاں کھو گیا اور جب میں گھر پہنچ کر چائے پیتے ہوئے اخبار پر دوبارہ نظر ڈالنے لگا تو ابراہیم کہیں نہ تھا۔ نہ میرے پاس۔ نہ میری یادوں کے پاس ــ شاید وہ بھی بھیڑ میں گم ہو کر مجھے بھول چکا ہوگا۔

ابراہیم کی یاد کبھی کبھی آتی ضرور لیکن ایسے جیسے رات کے ایک دو بجے مغرب سے مشرق کی جانب پرواز کرنے والے اس طیارہ کی آواز جسے کمرہ سے نکل کر آسمان میں دیکھیے تو ذرا کی ذرا میں نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

جب بھی کرسچین کالج کے سامنے سے گذرتا میری نظریں خود بخود اس ڈھلان کی طرف مڑ جاتیں لیکن پل تک پہنچتے پہنچتے یا پھر اس سے پہلے ہی سامنے سڑک پر آنے والی گاڑیاں ٹرک، سائیکلیں، اور اچھے برے چہرے ہوتے۔ ان میں ابراہیم کا چہرہ نہ ہوتا۔

کئی سال گذر گئے، کھا بڑ کھوبڑ میدان میں بے رحمی سے ابھی ابھی توڑے ہوئے گلاب کی پنکھڑیاں مرجھا گئیں کہ ان پر پیار سے ہاتھ پھیرنے والا کوئی نہ تھا۔ جب انھیں یاد کرنے والا بھی کوئی نہ تھا تو پھر ابراہیم کو کون یاد کرتا ــــ دفتر کی مصروفیات، شہرت کا تازہ تازہ نشہ، حضرت گنج کی چہل پہل، سائیکل کے چکر لگانے والے پہیے اور وہ ٹانگیں جو پیڈل

کو گھمایا کرتیں، وہ نفرتیں جو محبت کا بدل تھیں، وہ محبتیں جو نفرتوں سے تحفظ کرتی تھیں ان سب میں کوئی گھر جائے تو ابراہیم کہاں رہے گا؟ کہیں رہے، دل میں تو اس کے لیے ہرگز جگہ نہ نکل سکے گی۔

پھر ایک دن، کئی سال بعد، اسی تراہے کے موڑ پر وہی سائیکل سوار نظر آیا جسے دیکھ کر میں بس کی سیٹ میں پھڑپھڑا کے رہ گیا تھا۔ میں نے اپنی سائیکل اسی ڈھلان پر موڑ دی اور چند ہی منٹوں میں اس مکان کے سامنے رک گیا جہاں مجھ سے آگے جانے والی سائیکل رکی تھی۔

میں نے کہا۔ "معاف کیجیے، آپ ابراہیم کے بھائی تو نہیں ہیں؟"

دو آنکھوں نے مجھے پلٹ کر دیکھا تو میں نے جان لیا کہ میرا سوال بیکار تھا۔ وہ ابراہیم کے بھائی ہی تھے لیکن انھوں نے مجھے پہچانا نہیں تھا۔ دہرا بدن، سیاہی کی سرحدوں کو چھوڑ کر نفسی رنگ اختیار کرتے ہوئے بال، آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ، وہ مجھے بھلا کیا پہچانتے۔ ان کی آنکھوں میں اجنبیت تھی۔

"میں عابد سہیل ہوں۔" میں نے کہا۔

ان آنکھوں میں اجنبیت اب بھی برقرار تھی۔

"جی نہیں سید محمد عابد ـــــ اور ٹی میں رہتا تھا۔ ابراہیم کا کلاس فیلو تھا۔"

"دیکھتا ہوں۔ شاید ہوں۔" انھوں نے کہا۔ لیکن آنکھوں میں ناشناسی اب بھی تھی۔

میں ابھی سائیکل میں تالا لگا بھی نہ پایا تھا کہ ایک گورے سے بچے نے باہر کے کمرہ کا دروازہ کھول دیا۔

"بیٹھیے، ابو آتے ہیں۔" اس نے کہا اور کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے ایک نظر کمرہ پر ڈالی لیکن آنکھیں پھر اس دروازہ پر ٹک گئیں جو اس کمرہ کو مکان کے اندرونی حصے سے جوڑتا تھا۔ چند منٹوں بعد کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی ـــ میں

اضطراب میں کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی لمحہ ایک لحیم شحیم شخص کمرہ میں داخل ہوا۔ لیکن میری آنکھوں نے اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کی۔ وہ ابراہیم تھا۔

میں نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ وہ بھی آگے بڑھا اور ہم ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے جنھیں چھپانے کے لیے میں نے اپنی آنکھیں دھیرے دھیرے اس کی قمیص سے رگڑدیں اور پھر ہم پاس پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس کی آنکھوں میں کچھ بھی نہ تھا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ پھر میں نے سوچا ممکن ہے اس نے بھی آنسو میری قمیص میں جذب کر دیے ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میرا بایاں ہاتھ لاشعوری طور پر کندھے پر اس جگہ پہنچ گیا جہاں ابھی تھوڑی دیر قبل اس کا سر ٹکا تھا۔ میری انگلیوں کو ہلکی سی نمی کا احساس ہوا اور اس احساس نے دل کے کھنڈر کھوہ میدان میں لاوارث قبر کے پاس والے گلاب کے پودے سے بے رحمی کے ساتھ توڑے ہوئے پھول کی پنکھڑیوں کو تر و تازہ کر دیا۔

"ہم لوگ کتنے سال بعد مل رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے انگلیوں پر کچھ حساب لگایا، پھر کچھ سوچا اور کہا۔

"پندرہ سال بعد۔"

"غلط"۔ میں نے جواب دیا۔ "پورے بیس سال بعد، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔"

پچیس سال پہلے تو دو برسوں کو بھی ہم نے درمیان سے غائب نہیں ہونے دیا تھا اور انھیں جیسے واپس لے آئے تھے لیکن آج بیس سے زائد بلکہ پچیس سال کیسی آسانی سے کھو گئے تھے۔

مجھے کچھ سوچتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"یہاں کیا کر رہے ہیں آپ —— تم ——؟"

الفاظ کی ترتیب کچھ ایسی تھی کہ "آپ" کو "تم" سے بدلنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے اس نے جملہ ہی بدل دیا "کیا کر رہے ہو۔؟"

"ایک اخبار میں کام کرتا ہوں، اور آپ، تم ؟"

" اریگیشن آفس میں ہوں ۔"

" شادی کب ہوئی ؟" میں نے پوچھا۔

اس نے پھر انگلیوں پر حساب لگایا ۔

" کوئی پندرہ سال ادھر ۔"

میں نے اسے دوسری بار انگلیوں پر حساب لگاتے دیکھا تو پوچھا۔

"کیا تم نے بی کام کیا ہے ؟"

وہ مسکرایا ۔

" ہاں اریگیشن آفس میں اکاؤنٹنٹ ہوں ۔"

میں بھی مسکرا دیا ۔

" بھابھی کہاں ہیں ؟" میں نے انگلیوں پر کی جانے والی گنتی کو زیادہ دیر تک اگلے سوال کی راہ میں حائل نہ ہونے دیا ۔

" کہیں گئی ہوئی ہیں ۔"

" اور بچے کتنے ہیں ؟" میں نے پوچھا۔

" دو لڑکے، ایک لڑکی ۔"

" پہلا بچہ تو اب ماشاءاللہ بڑا ہو گا ۔"

" ہائی اسکول کا امتحان دے گا اگلے سال ۔"

پھر اس نے بھی میرے بارے میں یہی باتیں دریافت کریں ۔

اس کے بعد ۔

" اور کیا حال چال ہیں ؟"

" خدا کا شکر ہے ۔"

"گرمی بہت ہو رہی ہے آج۔"

"لیکن کل سے کم ہے۔"

"اور ـــــ"

وہ مسکرایا۔

"باقی سب ٹھیک ہے۔"

اب کمرہ میں مکمل سناٹا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے سارے سوال پوچھ چکے تھے۔ سارے جواب دے چکے تھے۔ اب یہ سناٹا مجھے کاٹنے لگا تھا۔ شاید اسے بھی۔

اس نے کہا "ملتے رہیے گا۔"

میں نے اس جملہ کے وہی معنی لیے جو میں چاہتا تھا اور شاید تھے بھی۔

"ضرور ـــــ کیوں نہیں۔" میں نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ابراہیم مجھے باہر تک چھوڑنے آیا۔ میں نے سائیکل کا تالہ کھولا۔ پھر اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ ٹھنڈا تھا۔ میرا ہاتھ بھی کچھ ایسا گرم نہ تھا۔ میں نے پیڈل پر پیر رکھا تو وہ مجھ پر ایک نظر ڈالے بغیر گھر کے دروازے کی طرف مڑ گیا۔ میں نے بھی پلٹ کر نہ دیکھا۔

یہ ہم دونوں کی آخری ملاقات تھی۔ اسے پندرہ برس ہو چکے ہیں۔

■■

میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں

(جوگندر پال کے نام)

میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ اُس وقت بھی جھوٹ نہیں بولا تھا جو میں نے پکڑے جانے کے بعد کہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت میں بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اصل میں میرے خاندان میں اس سے پہلے کوئی گرفتار نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب میری گھبراہٹ دور ہو چکی ہے۔ ویسے اِس سمے جیل سے باہر ہوں۔ لیکن اب مجھے جیل میں بھی گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ اس لیے آپ کے سامنے سب کچھ سچ سچ بتائے دیتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں جج صاحب، یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہم بہادر قوم کے لوگ ہیں۔ کور رانی بھی ہماری ہی ذات کی تھی۔ اس کی رگوں میں بھی شرافت کا وہی خون دوڑ رہا تھا۔ اپنا ارادہ اس نے خود ہی ظاہر کیا تھا۔ ہم لوگوں نے اس کو مجبور نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ میرے سامنے ہی ہوا تھا۔ میں بھی اس کی بات سن کر بہت خوش ہوا تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے اس کے لیے اسے راضی کیا تھا۔ مجبور تو ہم نے بالکل بھی نہیں کیا تھا، لیکن میرا سینہ فخر سے پھول گیا تھا۔ اصل میں اس وقت اُس کی آنکھیں روتے روتے سوجی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں، بالوں پر دھول اُڑ رہی تھی۔ دھول ہم نے نہیں ڈالی تھی۔ ہم نے اسے ایسی حالت بنانے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ میں اصل میں ساری بات بالکل شروع سے بتا رہا ہوں۔

رکمنی نے جو یہ کہا ہے کہ اس نے بھابھی کی مٹھی میں دھول رکھ کر یہ کہا تھا کہ اسے بالوں میں

ڈال لو تو یہ بالکل غلط ہے۔ اس نے یہ بات بالکل جھوٹ کہی ہے۔ جھوٹ نہیں کہا بلکہ بھول گئی ہو گی۔ اس نے مجھ کو خود بتایا تھا کہ بھابھی نے جب چاروں طرف نظر یں دوڑائیں تو میں سمجھی کہ وہ دھول تلاش کر رہی ہیں۔ ہم غریب آدمی ہیں لیکن ہمارا مکان پکا بنا ہے۔ فرش بھی پکا ہے۔ وہاں مٹی کہاں ملتی۔ پہلے یہ مکان پکا نہیں تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بھائی صاحب کی شادی کے وقت پکا نہیں تھا۔ جی تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ رکمنی نے خود سے مٹی لاکر نہیں دی تھی۔ میری بہن بہت عقلمند ہے۔ اس کی عقل کی سب لوگ تعریف کرتے ہیں۔ اس نے بھابھی کے دل کی بات جان لی تھی اور باہر کی پھلواری سے تھوڑی سی مٹی لاکر اس کے ہاتھ میں رکھ دی تھی۔ لیکن بھابھی کے ہاتھ ہل تک نہیں رہے تھے۔ یہ بات مجھے رکمنی نے خود بتائی تھی۔ اسے ایسا لگا تھا کہ بھابھی مٹی اپنے سر پہ ڈال لینا چاہتی تھی۔ ایک ہی دن میں وہ اتنی کمزور ہو گئی تھیں کہ ان کے ہاتھ ہل تک نہیں رہے تھے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ رکمنی بہت عقل والی ہے۔ اس نے بھابھی کا وہ ہاتھ اٹھا کر جس میں اس نے مٹی رکھ دی تھی، بھابھی کے سر پہ رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد بھی بھابھی ہاتھ ہلا تک نہ سکیں تو رکمنی نے اپنے ہاتھوں سے ان کا ہاتھ زور زور سے ہلایا تو بھابھی کے سر اور چہرے پر مٹی پھیل گئی ــ میں نے کہا تھا کہ رکمنی نے یہ بات بالکل غلط بتائی تھی کہ اس نے بھابھی کی مٹھی میں دھول رکھ کر ان سے یہ کہا تھا کہ اسے بالوں میں ڈال لو۔

لیکن یہ بات میں نے بیچ سے بتائی ہے۔ اب میں ساری بات بالکل شروع سے بتاتا ہوں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ ہم لوگ عزت دار آدمی ہیں۔ ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے کہ بھابھی بھیا کے ساتھ بس دس پندرہ دن ہی رہی تھیں۔ شروع میں تین چار دن، اس کے بعد سات آٹھ دن، پھر دو تین دن بالکل آخر میں۔ لیکن اس کا اصل بات سے کیا تعلق؟ بھائی صاحب کی موت سے ان پر سکتہ ساطاری ہو گیا تھا۔ جبھی تو وہ روئی بھی نہیں تھیں۔ بس گُم سُم بیٹھی رہی تھیں۔ اصل میں وہ ہم لوگوں کو اتنا چاہتی تھیں کہ ہمارے سامنے رو کر ہمارا دکھ نہیں بڑھانا چاہتی تھیں۔ لیکن جب رکمنی نے ان کے سر پہ دھول ڈالی ـــــ جج صاحب میں

کہہ چکا ہوں کہ میں بے وقوف آدمی ہوں ۔ اِدھر کی باتیں اُدھر جوڑ دیتا ہوں ۔ رکمنی نے ان کے سر پر مٹی نہیں ڈالی بلکہ ان کی مدد کی تھی ۔ بھابھی نے اپنے کمرہ میں جاتے وقت دیوار میں ٹنگے بڑے آئینے میں اپنی صورت دیکھی ہوگی اور یہ سوچ کر کہ ان کی صورت سے بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے پتی دیو کا دیہانت ہوگیا ہے وہ پریشان ہوگئی تھیں ۔ میرا مطلب ہے پریشان ہوگئی ہوں گی ۔ آئینہ اتنا بڑا نہیں ہے کہ اس میں دور ہی سے کوئی اپنی صورت دیکھ لے ۔ لیکن بھابھی نے اپنی صورت ضرور دیکھ لی ہوگی اور اسی لیے پریشان ہوگئی ہوں گی ۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ بھابھی کے سر پر دھول رکمنی نے نہیں ڈالی تھی ۔ بس ان کی مدد کی تھی ۔ رکمنی ہے تو بہت عقل والی لیکن میری طرح سیدھی سادی بھی ہے ۔ اس نے بھابھی کی مدد کی تو سمجھی کوئی بہت اچھا کام کیا ہے ۔ اس لیے اس نے آپ کے سامنے کہہ دیا کہ بھابھی کے سر میں دھول اس نے ڈالی ہے ۔

رکمنی نے جو یہ کہا کہ بھابھی بالکل چپ چاپ ہوگئی تھیں اور روئی بالکل نہیں تھیں تو آپ اس کا کوئی غلط مطلب نہ لیں ۔ میں آپ کو ساری بات بالکل شروع سے بتاتا ہوں ۔ جب میں ساری بات بتا چکوں گا تو آپ کو یقین آجائے گا کہ میں بالکل سچ بول رہا ہوں ۔ ایک بات بھی جھوٹ نہیں کہی ہے میں نے ۔ اصل میں ہم لوگ عزّت دار آدمی ہیں ۔ ہم جھوٹ نہیں بولتے ۔ ہم نے تو شادی کے بعد بھابھی کو کسی وقت ہنستے بھی نہیں دیکھا ۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ شادی سے خوش نہیں تھیں ۔ اور جو وہ ہمارے یہاں دو تین دن رہنے کے بعد اپنے گھر چلی گئی تھیں اور تین مہینے بعد لوٹی تھیں تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گھر والوں کو بتانا چاہتی تھیں کہ وہ کتنی خوش ہیں ۔ بھائی صاحب بھابھی کے ساتھ نہیں جاسکے تھے کیونکہ وہ بیمار تھے اور علاج کرا رہے تھے ۔ ان کے نہ جانے کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ ان کو روزانہ پولیس چوکی میں حاضری لکھانا پڑتی تھی ۔ وہ بیمار نہ ہوتے تو ان کے ساتھ ضرور جاتے ۔ برات لے کر جانے کے لیے بھی تو ان کو پولیس نے دو دن کی اجازت دے دی تھی ۔ اس بار بھی مل جاتی ۔ لیکن رپورٹ ان کے خلاف بالکل جھوٹی لکھائی گئی تھی ۔ وہ پکڑے نہیں گئے تھے ۔ بس پولیس صحیح بات معلوم کرنے کے لیے ان کو اپنے ساتھ لے گئی تھی ۔

وہ کیس بالکل جھوٹا تھا۔ اس کا فیصلہ ہوتا تو آپ کو خود ہی معلوم ہو جاتا۔ لیکن بھائی صاحب کی موت سے اب سچائی چھپی رہ جائے گی۔

تو میں جج صاحب ساری بات بالکل شروع سے بتا رہا ہوں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ بھابی ہمارے گھر میں بہت خوش تھیں۔ لیکن آپ تو جانتے ہیں کہ خوشی کے دن کتنی جلدی گذر جاتے ہیں۔ اصل میں بھابھی ہمارے یہاں اتنے کم دنوں نہیں رہیں جتنے میں نے ابھی بتائے تھے۔ ہم لوگ بھی اتنے خوش تھے کہ جتنے دن بھی وہ رہیں ایسا لگا جیسے بس دو تین دن میں گذر گئے ہوں۔ میں یہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنے گھر جو اتنے زیادہ دنوں رہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو یہ بتانا چاہتی تھیں کہ وہ کتنی خوش ہیں۔ خوشی کے دن تو جلد ہی گذر جاتے ہیں لیکن اگر کوئی خوشی کے دنوں کی باتیں بتائے، چاہے وہ دو ایک دن کی خوشی ہی کیوں نہ ہو تو کئی دن لگ جائیں گے۔ بلکہ شاید پورا مہینہ لگ جائے پھر بھی بات پوری نہ ہو۔ میں پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں اس لیے ادھر کی بات ادھر جوڑ دیتا ہوں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ کسی نے بھابھی کے سر پہ مٹی نہیں ڈالی تھی۔ ہم لوگ عزّت دار آدمی ہیں۔ ہم جھوٹ نہیں بولتے۔ میں سیدھا سادا آدمی ہوں اور میری ماتا جی ۔

لیجیے جج صاحب میں پھر بہک گیا۔ اصل میں ساری بات میں بالکل شروع سے بتانا چاہتا ہوں۔ میرے بھیّا کو کوئی ایسی بیماری نہیں تھی۔ وہ بیمار تھے بھی نہیں۔ بس جانے کیا بات ہوئی کہ وہ ایک دم مر گئے۔ بھابھی کو تو بہت دیر تک یقین ہی نہیں آیا۔ بلکہ اسی کارن وہ روئیں تک نہیں کہ انھیں بھیّا کے مرجانے کا یقین ہی نہ تھا۔ ماتا جی پرانے زمانے کی عورت ہیں۔ بھابھی کی خاموشی ان کو بہت بری لگی۔ لیکن انھوں نے ان سے کچھ کہا نہیں۔ اپنے کمرہ میں اونچی آواز میں کچھ بولی ہوں تو بات دوسری ہے۔ لیکن بھابھی نے ان کی آواز بالکل نہیں سنی ہوگی۔ وہ تو آنگن کے دوسرے طرف والے کمرہ میں تھیں جس میں ٹی وی رکھا ہوا ہے۔ جب ماتا جی چلّا رہی تھیں۔ اصل میں وہ چلّا نہیں رہی تھیں۔ ان کی آواز ہی اتنی اونچی ہے کہ دھیرے سے بھی بات کرتی ہیں تو

پڑوس والوں تک کو پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ بھابھی تو اس وقت ٹی وی والے کمرے میں تھیں۔ لیکن ٹی وی چل نہیں رہا تھا۔ ویسے مجھے ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں کہ ٹی وی چل رہا تھا یا نہیں۔ میں تو اس وقت گھر میں تھا نہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے اپنا دکھ بھلانے کے لیے انہوں نے ٹی وی کھول لیا ہو۔

ہم لوگ غریب آدمی ہیں۔ سیدھے سادے آدمی ہیں۔ ہمارے یہاں ٹی وی کہاں ؟ وہ تو بھابھی کو شادی میں ملا تھا۔ لیکن ہم لوگوں نے مانگا کچھ نہیں تھا۔ بھیّا نے موٹر سائکل بھی نہیں مانگی تھی۔ اور جھمکے، کرن پھول، سونے کے بُندے، چوڑیاں، گلے کا ہار یہ سب سامان بھابھی کے پاس ہی رہتا تھا۔ ان ہی کا تو تھا۔ ہمیں اس سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ پھر ہم عزت دار آدمی ہیں۔ کسی دوسرے کی چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ ہم لوگوں نے تو یہ ساری چیزیں بس اس وقت دیکھی تھیں جب بھابھی بیاہ کر آئی تھیں۔ لیکن سامان رہتا بھابھی کے پاس ہی تھا۔

میں ساری بات بالکل شروع سے بتا رہا ہوں۔ ہم لوگوں نے مانگا کچھ نہیں تھا۔ نہ نقد نہ کوئی زیور۔ بھابھی کے پتا جی نے پچیس ہزار کا بنک کا کاغذ اپنی بیٹی کو دیا تھا۔ کوئی اپنی بیٹی کو جو بھی چاہے دے دے۔ ہم لوگ روکنے والے کون ہوتے ہیں ؟ بھیّا اسے لینے سے انکار کیوں کر دیتے۔ لیکن بھیّا نے اسے خرچ نہیں کیا تھا۔ بس بنک کا کاغذ اپنے حساب میں جمع کر دیا تھا۔ فرش پکا کرانے میں بھی بھیّا نے یہ روپیہ خرچ نہیں کیا تھا۔ وہ روپے تو ان کو سلام کرائی میں ملے تھے۔ بھیّا سلام نہ کرتے تو ان کے سسرال والے کیا کہتے۔

ہاں تو میں زیور کی بات کر رہا تھا۔ زیور سارا رہتا بھابھی ہی کے کمرے میں تھا۔ لوہے کے بکسے میں۔ لیکن بھابھی کے پاس کوئی تالا نہیں تھا اس لیے ماتا جی نے اپنا تالا ڈال دیا تھا۔ بھابھی کے پاس چابی کا گچھا بھی نہیں تھا، سو ماتا جی نے چابی اپنے گچھے میں ڈال لی تھی۔ لیکن اس کا بھیّا اور بھابھی کی موت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات میں نے اس لیے بتائی کہ میں ساری بات بالکل

شروع سے بتانا چاہتا ہوں۔

رکمنی کی یہ بات کہ بھابھی باغ میں جا کر چھپ گئی تھیں، ٹھیک تو ہے لیکن ویسی نہیں جیسی معلوم ہوتی ہے۔ اصل میں وہ ہم لوگوں کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھیں، اس لیے چپکے سے باغ میں چلی گئی تھیں۔ اور کوئی وجہ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس وقت تک تو ہم لوگوں نے انھیں کچھ بتایا بھی نہیں تھا اور کچھ بتانے کو تھا بھی نہیں۔ وہ تو خود ہی سب کچھ دیکھ چکی تھیں۔ اصل میں بھائی صاحب کی موت کا ان کو اتنا غم تھا کہ انہوں نے موہنہ سے ایک بول بھی نہیں نکالا تھا۔ لیکن ہم لوگوں نے ان کے دل کی بات جان لی تھی۔ اصل میں ہم لوگ سیدھے سادے آدمی ہیں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ تو جب رات گئے ان کا بستر خالی ملا تو ہم لوگوں نے انھیں ڈھونڈھنا شروع کیا۔ ہمیں ڈر ہوا کہ کہیں بھیّا کے غم میں بھابھی کنوئیں تالاب میں کود کر جان نہ دے دیں۔ وہ اس طرح جان دے دیتیں تو دنیا ہم کو کیا کہتی۔ ہم غریب ہیں لیکن عزت دار آدمی ہیں۔ لیکن وہ کہیں نہیں ملیں۔ ہم نے ایک ایک کنواں، ایک ایک تالاب دیکھ ڈالا۔ جنگل سے رونے کی آواز نہیں آرہی تھیں۔ آپ اسے چاہے جنگل کہیں چاہے باغ۔ دو چار پھول بھی وہاں لگے رہتے ہیں۔ جیسا میں نے کہا جنگل سے رونے کی آواز نہیں آرہی تھی۔ اصل میں بھابھی خاموش طبیعت کی عورت تھیں۔ جب وہ کہیں نہیں ملیں تو ہم لوگوں نے انھیں جنگل میں ڈھونڈا۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ چھپ نہیں گئی تھیں۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اصل میں ٹارچ کی روشنی سے ان کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ اس لیے وہ برگد کے درخت کے پیچھے چلی گئی تھیں یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ رو رہی ہوں اور یہ بات ہم لوگوں سے چھپانے کے لیے وہ برگد کی جٹاؤں میں چھپ گئی ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ ہم لوگوں سے چھپ رہی تھیں۔ جب پتاجی نے انھیں پکارا تو وہ باہر نکلنے کے لیے فوراً آگے بڑھی تھیں لیکن ان کے کپڑے جٹاؤں میں پھنس گئے تھے۔ انہوں نے یہ سوچ کر کہ ہم لوگ یہ نہ سمجھیں کہ وہ باہر نہیں آنا چاہتیں جلدی سے باہر نکلنے کی کوشش کی تھی جس سے ان کے سر پر جگہ جگہ کھرونچ لگ گئی تھی۔ میں اصل میں ساری بات بالکل شروع سے

بتا رہا ہوں اس لیے باتیں الجھ جاتی ہیں۔

ہم نے انھیں جنگل سے گھر لانے میں کوئی زور زبردستی نہیں کی تھی۔ وہ گھر اپنی مرضی سے راضی خوشی آئی تھیں۔ ہم لوگوں نے کوئی زبردستی نہیں کی تھی۔ پتاجی نے جب بھابھی کی بانہوں سے خون بہتے دیکھا تھا تو کہا تھا، تمور کو چلنے میں تکلیف ہو رہی ہوگی۔ ہم لوگ سیدھے سادے آدمی ہیں اور میں بالکل ساری باتیں شروع سے سچ سچ بتا رہا ہوں۔ پتاجی نے کہا تھا کہ بھابھی کو پیدل چلنے میں تکلیف ہوگی کیونکہ ان کی بانہوں سے خون بہہ رہا تھا اسی لیے ہم نے انھیں اٹھا لیا تھا۔ لیکن ہم نے انھیں گود میں نہیں اٹھایا تھا۔ بھابھی کو گود میں کون اٹھاتا ہے۔ ہم انھیں چاروں ہاتھوں پاؤں سے لٹکا کر بہت آرام سے گھر لائے تھے۔ اس میں ان کو تکلیف بالکل نہیں ہوئی تھی۔

جج صاحب ہم لوگوں کو اپنی عزّت کا بہت خیال رہتا ہے۔ ہم کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس سے ہماری عزّت پر کوئی انگلی اٹھا سکے۔ ہم انھیں گود میں لاتے اور کوئی دیکھ لیتا تو کیا کہتا۔ ہماری کیا عزّت رہ جاتی۔ یہ بالکل غلط ہے کہ بھابھی کے گھر والے جہیز کا سارا سامان واپس مانگ رہے تھے۔ وہ مانگ ہی کیسے سکتے تھے۔ ان کو بھیّا اور بھابھی کے مرنے کی خبر ہی بہت دیر میں ملی تھی۔ لیکن ہم لوگوں نے کچھ چھپایا نہیں تھا۔ بس کسی کو دھیان ہی نہ آیا کہ بھابھی کے گھر والوں کو خبر کر دی جائے۔ اصل میں بھابھی رو نہیں رہی تھیں اس لیے ہم بہت پریشان تھے۔ نہیں تو ایسی کون سی بات تھی۔ میں ہی موٹر سائکل پر جا کر انھیں خبر دے سکتا تھا۔ دو ہی گھنٹے کا تو راستہ ہے۔ موٹر سائکل ملی تو بھیّا کو تھی لیکن انھوں نے مجھے دے دی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ جب شادی میں تجھے موٹر سائکل ملے تب اپنی چلانا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں جہیز میں موٹر سائکل مانگوں گا۔ ہم لوگ عزّت دار آدمی ہیں۔ شادی بیاہ میں اپنے موہنہ سے کچھ نہیں مانگتے۔ کوئی براتی کچھ کہہ دے یا کوئی شرط رکھ دے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بھلا کوئی براتیوں کا موہنہ بند کرتا ہے۔

اصل میں بھابھی کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ ہم لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ جنگل میں اپنے پتی دیو کی موت پر رونے کے لیے گئی تھیں۔ پتاجی نے انھیں بہت سمجھایا تھا لیکن ان کی سمجھ میں

کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ اور پھر ایک دن بعد ساری دنیا کو پتہ لگ ہی جاتا کہ انھیں بھیّا کے مرنے کا کتنا دکھ تھا لیکن یہ بات ہم نے اس وقت ان کو نہیں بتائی تھی۔ مکان میں لے جاتے وقت ان کا شریر کواڑ سے ٹکرا گیا تھا جس سے وہ بیہوش ہوگئی تھیں۔ ہم کو اس بات کا پتہ ایسے چلا کہ شریر اتنی زور سے کواڑ سے ٹکرایا تھا پھر بھی ان کے موہنہ سے ہلکی سی چیخ بھی نہیں نکلی تھی۔

عزّت کی بات ہو تو جج صاحب کوئی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ پھر ہم لوگ تو عزّت دار آدمی ہیں — بھابھی کو ان کے کمرے میں بند نہیں کیا گیا تھا۔ ان کو بند کیوں کیا جاتا؟ ماتا جی نے مجھ سے دروازہ باہر سے بند کرنے کو کہا بھی نہیں تھا۔ لیکن ان کو بہت دکھ تھا کہ بھابھی رو نہیں رہی ہیں — ان کے اس دکھ کا ہم لوگوں کو ایسے پتہ لگا تھا کہ جب انھیں کوئی بات اچھّی نہیں لگتی ہے تو وہ چلّانے لگتی ہیں یا پھر بالکل چپ ہو جاتی ہیں۔ ویسے وہ خود بھی سب سے کہہ رہی تھیں کہ بھابھی کے نہ رونے کا کارن یہ ہے کہ وہ ہم لوگوں کا دکھ بڑھانا نہیں چاہتیں۔ انہوں نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ انھوں نے تو مجھ سے بھی دروازہ باہر سے بند کرنے کو نہیں کہا تھا۔ اور پھر بھابھی تو بیہوش تھیں وہ آتا بھاری دروازہ کھول بھی کیسے سکتی تھیں۔ میں نے ہی سوچا تھا کہ بھابھی کی طبیعت خراب ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ رات برات اٹھیں اور آنگن میں رکھی کسی چیز سے ٹکرا کر گر جائیں۔ اس سمے میں ان کی بیہوشی کی بات بھول گیا تھا اس لیے میں نے ہی باہر سے زنجیر چڑھا دی تھی۔ ان کو کمرہ میں بند کرنا ہوتا تو میں نے تالا ڈال دیا ہوتا۔ لیکن میں نے تالا نہیں ڈالا تھا۔ بس کنڈھا پھنسا دیا تھا۔

میں ساری بات بالکل شروع سے بتا رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کا آنا جانا ہمارے یہاں بہت دنوں سے تھا۔ گھر کے سب لوگ انھیں کا علاج کرتے تھے۔ بھائی صاحب کا علاج بھی انہوں نے ہی کیا تھا۔ ان کو بہت دکھ تھا کہ وہ بھائی صاحب کو بچا نہیں پائے تھے۔ جب رات میں وہ آئے اور انھیں پتہ لگا کہ بھابھی کو چوٹ لگ گئی ہے تو انھوں نے انھیں فوراً دیکھا۔ ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کو بلا کے نہیں لائے تھے۔ بھابھی کا علاج

کرنے کے لیے ہم لوگوں نے نہیں کہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دوا بھی پلائی تھی اور انجکشن بھی لگایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بہت مشہور آدمی ہیں۔ بڑے اچھے ڈاکٹر بھی ہیں۔ ہم لوگ بہت خوش تھے کہ بھابھی کی طبیعت ٹھیک ہو رہی ہے۔ لیکن وہ ابھی بالکل ٹھیک نہیں ہوئی تھیں۔ ہم لوگ عزّت دار آدمی ہیں۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ بھابھی کچھ بول نہیں رہی تھیں بس ادھ کھلی آنکھوں سے ہم لوگوں کو ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی تھیں لیکن ان کو ہوش نہیں آیا تھا۔

دلہن انھیں محلّہ پڑوس کی عورتوں نے بنایا تھا۔ وہ خفا نہیں لگ رہی تھیں۔ کچھ کچھ خوش ہی تھیں۔ لیکن کچھ ایسی خوش بھی نہیں تھیں۔ ہم لوگ ان کو پکڑ کر نہیں لے گئے تھے۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ بھیّا کی موت کا انھیں بہت دکھ تھا۔ دلہن بناتے سمے ماتاجی اور رکمنی نے انھیں پکڑ نہیں رکھا تھا۔ کمزوری سے ان کی آنکھیں بند تھیں اور سر پیچھے کو ڈھلک جاتا تھا۔ رکمنی بس مضبوطی سے ان کا سر پکڑے ہوئے تھی اور ماتاجی نے ان کو اس لیے پکڑ رکھا تھا کہ کہیں بیہوشی میں ان کا ہاتھ مہندی کے کٹورے یا سیندور کی ڈبیا پر نہ پڑ جائے۔ لیکن وہ بیہوش نہیں تھیں۔ میں ساری بات بالکل شروع سے بتا رہا ہوں۔ بھابھی بھیّا کے ساتھ بہت خوش تھیں۔ وہ ان سے اتنی خوش تھیں کہ جب بھیّا غصّہ ہوتے تھے تو وہ جواب بھی نہیں دیتی تھیں۔ جی ہاں یہ بالکل غلط ہے کہ میں اور پتاجی ان کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ ہم نے ان کو ڈھکیلا بھی نہیں تھا۔ خوشی خوشی اپنے پیروں سے چل کر گئی تھیں لیکن چونکہ وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں اور کچھ بیہوش بھی تھیں اس لیے میں نے اور پتاجی نے ان کی بانہیں مضبوطی سے پکڑ لی تھیں۔ لیکن ہم ان کو چھوڑ بھی دیتے تو بھی وہ جاتیں ضرور چاہے کمزوری کے مارے گر ہی کیوں نہ پڑتیں۔

میں ساری بات شروع سے بتا رہا ہوں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ یہ بات بالکل جھوٹ ہے کہ انھوں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ میں عزّت دار آدمی ہوں۔

جھوٹ نہیں بول رہا ہوں ۔ یہ بات بالکل جھوٹ ہے ۔ بھابھی نے بھاگنے کی کوشش بالکل نہیں کی تھی ۔ اور وہ بھاگ بھی کیسے سکتی تھیں ۔ گڈھا اتنا گہرا تھا کہ وہ اس سے نکل ہی نہیں سکتی تھیں ۔ بھاگتیں کیسے ! انھوں نے شور بھی نہیں مچایا تھا ۔ وہ چیخی چلائی بھی نہیں تھیں ۔ یہ بات بالکل من گھڑت ہے کہ وہ چیخ چلا رہی تھیں ۔ ہزاروں آدمی زور زور سے جے جے کار کر رہے تھے ۔ ان کی چیخ سنائی ہی نہیں دے سکتی تھی ۔ کسی نے کوچیخیں نہیں سنا تھا ۔ میں سیدھا سادا آدمی ہوں ۔ عزت دار ہوں ۔ جھوٹ نہیں بول رہا ہوں ۔ اصل میں ساری بات بالکل شروع سے بتانا چاہتا ہوں ۔ بھابھی روئی ......

پس نوشت : عدالت نے اس گواہی کا ایک ایک لفظ صحیح تسلیم کرتے ہوئے سارے ملزمان کو باعزت بری کر دیا ۔

▪▪

پوستین

دوکاندار نے دوسرے گاہکوں کی نظریں بچا کر کپڑے کے پیکٹ کے ساتھ ایک کلنڈر نسرین کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ پیکٹ کے ساتھ کلنڈر اس نے کچھ اس طرح چھپا دیا تھا کہ دوکان میں موجود دوسرے لوگوں کے لیے جنہیں کوئی کپڑا پسند ہی نہ آرہا تھا اور ایک کے بعد دوسرا تھان کھلوا رہے تھے، اسے دیکھ لینا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ اسی لمحہ نسرین کی نظر اس ساڑی پر پڑی جو بلاؤزوں کے کپڑوں کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔

"ذرا وہ ساڑی تو دکھلائیے۔" اس نے کہا۔

"پکچر شروع ہو جائے گی۔" میں نے کسی قدر بیزاری کا اظہار کیا۔

"ابھی سے کیسے شروع ہو جائے گی۔" وہ بولی ـــــ "اور پھر آپ نے ایڈوانس بکنگ بھی تو کرا رکھی ہے ـــــ جی ہاں ـــــ وہی نیلی والی، نارنجی نہیں۔" وہ میری بات کا جواب دیتے دیتے یکایک سیلس مین کی جانب مخاطب ہو گئی۔

میں نے کپڑوں کی خریداری میں کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار کرنا بالکل ہی ختم کر دیا۔ پہلے تو کپڑوں سے اٹی ہوئی دوکان کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھتا رہا، پھر بے خیالی میں ربر بینڈ کھسکا کر اس کلنڈر کو دیکھنے لگا جو ساری کے پیکٹ کے ساتھ نسرین نے میرے حوالے کر دیا تھا۔

کلنڈر کیا تھا پورا میدان جنگ تھا ــــــ بائیں کونے میں ہوائی جہاز کسی دشمن ملک پر بم برسا رہا تھا، دائیں طرف ایک فوجی آٹومیٹک گن لیے دشمنوں پر گولیوں کی بوچھار کر رہا تھا، نیچے ایک سمندری جہاز، جو کاغذ کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا، دھواں دھار گولہ باری کر رہا تھا اور دوسری طرف ایک کسان سینہ تک اگی ہوئی فصل کے درمیان ہل لیے کھڑا تھا۔ درمیان میں ایک گوشے کے اندر ملک کے دو رہنماؤں کی تصویریں تھیں جن کے سامنے مخالف ملک کا سربراہ ہاتھ جوڑے گھگھیا رہا تھا۔ اسی لمحہ دوکان کے مالک نے ایک سیلزمین سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا اور اس نے بائیں الماری سے ایک تھان نکالنے کے بعد میرے پاس سے گذرتے ہوئے کلنڈر کا وہ حصہ جس پر دوکان کا نام تھا کچھ اس طرح موڑ دیا کہ اس پر دوسرے خریداروں کی نظر نہ پڑے۔

میں نے اشارہ سمجھ لیا، کلنڈر لپیٹ کر اس پر ربر بینڈ چڑھا دیا اور بیوی سے پوچھا۔

"خریداری پوری ہوگئی یا ابھی کچھ باقی ہے۔؟"

"بس جی ختم ہی سمجھیے ــــ یہ ساری آپ کو کیسی لگی؟"

"بہت اچھی، بشرطیکہ نیوز ریل بھی دیکھنے کو مل جائے۔"

بیوی نے خفگی سے میری طرف دیکھا اور دوکاندار سے بولی۔

"بس اسے جلدی سے پیک کرا دیجیے۔"

میں اسٹول پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن کھڑے ہونے سے قبل میں نے نہایت ہوشیاری سے وہ کلنڈر سامنے تخت پر پھیلے ہوئے کپڑوں کے درمیان دبا دیا۔ نسرین کیش میمو اور باقی پیسے واپس لے رہی تھی کہ اسی دوران دوسرے خریدار جو شاید کئی دوکانوں پر کپڑے دیکھ کر ان کی قیمتوں کا موازنہ کر رہے تھے ــــ "اچھا ابھی آتے ہیں" ــــ کہہ کر ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور سیلزمین نے جلدی جلدی کپڑوں کے تھان لپیٹنا شروع کر دیے۔ خطرہ کا اندازہ کر کے میں تیزی سے دوکان سے باہر نکل آیا۔ نسرین بھی دو پیکٹ

ہاتھوں میں لیے اور چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھیرے ہوئے جیسے ہی میرے قریب آئی، میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے ہاتھوں میں کپڑوں کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن میری یہ مسرت عارضی ثابت ہوئی، بے حد عارضی۔

"بابوجی"۔۔۔ ایک سیلزمین نے آواز دی۔

"آپ یہ تو چھوڑ ہی گئے۔"

بیوی نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جس میں میرے بھلکڑپن پر ہلکا سا احتجاج بھی تھا۔

"خود تو نہ کلنڈر لاتے ہیں نہ ڈائری اور کہیں سے کچھ مل جائے تو۔۔۔۔" اس نے اپنا جملہ پورا ابھی نہ کیا تھا کہ اسے زیادہ اچھا اور چبھتا ہوا جملہ سوجھ گیا اور اس نے کہا۔ "فروری کا مہینہ بس ختم ہونے ہی کو ہے اور اب تک نئے سال کا کوئی کلنڈر ہمارے گھر میں نہیں ہے۔ آج ایک ملا بھی تو آپ اسے چھوڑے آرہے تھے۔"

نسرین کا اندازہ درست تھا۔ میری گھڑی جو ہمیشہ وقت سے پیچھے چلتی ہے آج نہ جانے کیسے خاصی آگے ہوگئی تھی۔ پکچر شروع ہونے میں ابھی پورے پچیس منٹ باقی تھے۔

کئی ماہ قبل ہم لوگوں کے پورے آٹھ سو روپے جو ہم نے ایک بے حد ضروری کام کے لیے کئی مہینوں میں پس انداز کیے تھے نہ جانے کہاں کھو گئے تھے۔ آخر یہ ضرورت ہمیں قرض لے کر پوری کرنی پڑی اور یہ قرض ہم نے کئی ماہ تک قسطوں میں ادا کیا۔۔۔۔ ان روپلوں کا جب بھی خیال آتا تو ہم دل مسوس کر رہ جاتے۔۔۔ پھر دھیرے دھیرے یہ واقعہ ایک بھولی ہوئی یاد بن گیا۔

پچھلے ہفتے اپنی میز پر بکھری ہوئی کتابوں اور کاغذوں کو ترتیب سے لگاتے ہوئے مجھے ہلکے ہرے رنگ کا ایک کاغذ نظر آیا، ایک کتاب میں سے جھانکتا ہوا۔ میں نے اس کے اوپر رکھی ہوئی کاپی جس کا ایک حصہ دوسری طرف پھیلا ہوا تھا پلٹ کر ذرا غور سے

نظر ڈالی تو یہ زنگ نوٹ کا محسوس ہوا۔ میں نے جلدی سے کتاب اسی جگہ سے کھولی تو آٹھ ہرے ہرے نوٹ جیسے اس انتظار میں تھے کہ کوئی انھیں اٹھا لے ــــ جس وقت یہ روپے کھوئے تھے ہم نے گھر کا ایک ایک کونہ چھان مارا تھا۔ خود میں نے میز کی ایک ایک چیز ہٹا کر دو دو بار نوصز ورد یکھی تھی اور ان روپوں کے یوں غائب ہو جانے پر ہم بہت پریشان بھی ہوئے تھے، لیکن اس وقت میرے تن بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

میں نے جب یہ خبر نسرین کو سنائی تھی تو اس نے اسے مذاق سمجھا تھا۔ مجھے برا بھی محسوس ہوا تھا کہ وہ اتنی بڑی خوشی کو مذاق سمجھ رہی تھی۔ لیکن اس میں اس کا قصور نہ تھا۔ خود میں ہی تو ہر اس چھوٹی سی چھوٹی خواہش کو جس کا حصول ہمارے بس میں نہ تھا پہلے خواب اور پھر حقیقت کی شکل میں پیش کرتا رہا تھا۔

لیکن اس کے اور اپنے رویہ کا تجزیہ میں نے بہت بعد میں کیا۔ اس وقت تو مجھے الجھن ہو رہی تھی کہ وہ میری بات پر یقین کیوں نہیں کر رہی ہے۔

آخر میں نے قمیص کی جیب سے آٹھوں نوٹ نکال کر اس کے ہاتھوں میں رکھ دیے۔

وہ ایک دم ہنس پڑی۔ اس کا سارا جسم، اعضا کی ایک ایک حرکت، آنکھوں کا پھیلنا اور سکڑنا خوشی کے اظہار کے طور پر نوٹوں کو ہاتھوں میں تھامے تھامے ہوا میں لہرانا، ان آٹھ سو روپوں سے کہیں زیادہ اہم تھے جنھیں میں نے خوشیوں کی معراج سمجھ رکھا تھا۔

پھر یکایک ــــ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آنسو اس تیزی سے اس کے گالوں پر بہنے لگے کہ میں حیران رہ گیا۔ اس قدر حیران کہ اسے دلاسہ بھی نہ دے سکا۔

لیکن اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہ تھی۔ یہ خیال بھی مجھے بہت بعد میں آیا کہ جہاں آٹھ سو روپے اتنی بہاریں لا سکتے ہیں وہاں ان سے کہیں زیادہ آنسوؤں کا سبب بھی تو بن سکتے ہیں۔

دو تین دن خوشیوں اور اداسیوں کی اسی دھوپ چھاؤں میں گذر گئے۔ کبھی ہم یکایک خوش ہو جاتے، مسکرانے لگتے اور کبھی اداس، بے حد اداس۔

آخر ہم نے ان روپوں سے کئی برسوں کی محرومیوں کا حساب چکانے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے لیے باقاعدہ بجٹ بنا ڈالا جو کم و بیش سوا ہزار روپوں کا تھا۔ خاصی کانٹ چھانٹ کے بعد ہم اسے ساڑھے آٹھ سو تک لے آنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب اس میں کسی کمی کی گنجائش نہ تھی۔

"یہ تو روزے گلے پڑ گئے۔" نسرین نے کہا۔

لیکن نماز کا ثواب تو اپنی جگہ قائم ہے۔" میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔" اور تم بھی کیا کہو گی کہ کس رئیس سے پالا پڑا ہے۔" کہتے ہوئے مہنگائی بھتے کی وہ رقم جو "صرتِ جاں" کے لیے چھپا رکھی تھی اس کے ہاتھوں میں رکھ کر حساب برابر کر دیا۔

نسرین نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ لیکن روزمرہ کے ضروری اخراجات کے علاوہ ساڑھے آٹھ سو روپے خرچ کرنے کے جوش و خروش نے اسے اس طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا کہ اس نے شکوک و شبہات کا وہ پٹارہ جو ہر عورت ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ہے اس موقع پر کھولنا مناسب نہ سمجھا۔

لیکن اس وقت سوال یہ تھا کہ بیس پچیس منٹ کہاں اور کیسے گذارے جائیں —

ایک جیب میں روپے ہوں — ایسے روپے جن پر آٹے دال کا بوجھ نہ ہو — اور دوسری میں سینما کا ٹکٹ، تو ہوٹل سے بہتر جگہ کیا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ہم سینما گھر کے پاس ہی کے ایک اچھے سے ہوٹل میں چلے گئے۔ بسکٹ اور پیسٹری کے ساتھ کافی کا ایک ایک کپ چڑھانے کے بعد میں نے بل ادا کیا، اِدھر اُدھر دیکھا اور کلنڈر دھیرے سے میز کے نیچے ڈال دیا۔ ہم

دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن میں نسرین کی نظریں بچا کر اس میز کو بھی دیکھ لینا چاہتا تھا جسے بیرا صاف کر رہا تھا۔ اسی وقت اسے میز کے نیچے ربن میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نظر آئی۔ اس نے جھک کر اسے اٹھایا اور ہماری طرف لپکا۔

" بابو جی "۔ کہتے ہوئے اس نے کلنڈر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ اسے پانچ روپے ٹِپ کے طور پر دے کر میں نے بڑی غلطی کی تھی اسے ٹِپ نہ دیا ہوتا تو وہ شاید غصہ سے ہماری طرف گھور رہا ہوتا اور اگر کلنڈر پر اس کی نظر پڑ بھی جاتی تو اس قدر مستعدی اور ایمانداری کا ثبوت نہ دیتا۔

نسرین کا موڈ اس وقت اتنا اچھا تھا کہ وہ بس مسکرا کر رہ گئی۔ پھر ایک لمحہ کے بعد بولی۔

آپ کو بیرے کا شکریہ تو ادا کرنا چاہیے تھا۔ "

میں کیا کہتا۔ کھسیا کر رہ گیا۔

فلم بہت اچھی تھی۔ گٹھی ہوئی کہانی، چست مکالمے، قابلِ تعریف ایکٹنگ۔ دل خوش ہو گیا لیکن جب آخری سین میں وعدے کے باوجود ہیرو مقررہ تاریخ پر اپنی محبوبہ کے پاس نہ پہونچا اور کیمرے نے دیوار پر آویزاں کلنڈر میں ۱۹ راگست کو جس کے چاروں طرف سرخ روشنائی سے ایک گولا بنا دیا گیا تھا، فوکس کیا تو سخت کاغذ کا وہ ٹکڑا جو پسینہ سے کچھ کچھ بھیگ گیا تھا میرے ہاتھ میں کانٹے کی طرح چبھنے لگا تھا۔ اسی وقت مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ کھچا کھچ بھری ہوئی بالکنی کی یہ کرسیاں جو وزن ہٹتے ہی خود بخود بند ہو جاتی ہیں اس کے لیے نہایت عمدہ پناہ گاہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ اس کا ایک سرا ہتھے میں پھنس گیا اور پاس والی کرسی پر بیٹھے ہوئے صاحب نے جو اس انتظار میں تھے کہ بھیڑ کم ہو جائے تو باہر نکلیں، اپنے خلوص کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اٹھا کر میرے حوالے کر دیا۔ اس کارِ نیک پر وہ آپ ہی آپ مسکرائے، میں نے بھی مسکرا کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے

سوا چارہ ہی کیا تھا۔

ہال سے باہر نکلتے وقت فلم کے خوشگوار تاثر سے زیادہ اپنی اور ان کی مسکراہٹ کا بوجھ میرے دل پر چھایا ہوا تھا۔ لیکن ہلکی خنک ہوا اور موسم کی سحر انگیزی نے یہ بوجھ خاصا کم کر دیا۔

گھر واپس آنے کا قریب ترین راستہ گنجان آبادیوں سے گذرتا تھا لیکن ہم نے اس یادگار شام میں مزید رنگ بھرنے کے لیے رکشے پر خوشگوار ہوا کے جھونکوں کا لطف لینے کا فیصلہ کیا۔ سوا سو روپے اب بھی میری جیب میں موجود تھے۔ مرکری راڈ کی روشنی میں گومتی کے پاس والی سڑک سے رکشے پر گذرتے ہوئے ہمیں ایک عجیب سے سرور اور تازگی کا احساس ہو رہا تھا اور بائیں ہاتھ میں کلنڈر کی موجودگی کے باوجود مجھے ایک بار بھی اس کا خیال نہ آیا تھا۔ لیکن رکشہ جوں ہی اس سڑک کی طرف مڑا جس کے دونوں طرف کوڑے کے کچرے کے ڈھیر، سڑی گلی ترکاریوں کی بدبو اور نیم پختہ اور پرانے مکان، ماضی سے والہانہ لگاؤ کا احساس دلا رہے تھے، مجھے اپنے ہاتھ میں کسی کھردری سی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یہ وہی کلنڈر تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جا کر اس یادگار شام کی ایک وقتی چبھن کو اگلے آٹھ دس مہینوں تک کسی مستقل خلش کا سبب بننے کا موقع دینے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔

رکشہ جب بالکل گھر کے قریب پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ سڑک کی سامنے والی راڈ خراب ہو چکی تھی۔ عام حالات میں اپنے گھر کے سامنے اندھیرا دیکھ کر مجھے غصہ ضرور آتا اور میں کارپوریشن کے حکام کو، دل ہی دل میں سہی، برا بھلا تو کہتا ہی' لیکن اس وقت اس اندھیرے سے زیادہ روشن کوئی چیز نہ تھی۔ گھر جب بالکل قریب آ گیا تو میں نے وہ کلنڈر رکشہ کے کھلے ہوئے ہڈ میں رکھ دیا اور ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت رکشہ والے کو اپنے دو منزلہ کرائے کے مکان کی نیچے والی دوکان تک لے آیا جہاں زیرو پاور کا بلب سڑک کے اندھیرے سے ہاری ہوئی لڑائی لڑ رہا تھا۔ رکشہ والے کو روپے دے کر میں نے تیزی سے زینے کی

جانب قدم بڑھائے اور سیڑھی پر پہلا قدم رکھتے ہوئے اس کو مخاطب کیا :

" روپے گن لینا ، ٹھیک تو ہیں نا ؟ "

مقصد صرف یہ تھا کہ جب تک وہ رکشہ تک لوٹے ہم اس کی پہنچ سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جائیں اور اگر کلنڈر پر اس کی نظر پڑ بھی جائے تو زینہ کا اندھیرا اور اس پر چار چھ مکانوں کے کھلنے والے دروازے اسے ایمانداری کا مظاہرہ کرنے سے باز رکھیں ۔ لیکن میں ابھی دروازے کا تالا کھول ہی رہا تھا کہ ٹٹول ٹٹول کر زینے پر کسی کے آگے بڑھنے کے احساس سے مجھے پسینہ آگیا ۔ اسی لمحہ اس نے زینے کے موڑ سے کہا :

" صاحب ـــــ یہ آپ کا کاغذ ۔ "

میں بوجھل بوجھل قدموں سے نیچے اترا اور اس کے ہاتھوں سے کلنڈر لے کر اسی طرح دھیرے دھیرے زینے چڑھنے لگا ۔

▬▬

عیدگاہ

"تب ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی، حامد کے چمٹے سے بھی عجیب۔ بچّے حامد نے تو بڑھے حامد کا پارٹ ادا کیا تھا۔ بوڑھی امینہ بچّی امینہ بن گئی تھی، وہ رونے لگی۔ دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا راز کیا سمجھتا۔"[1]

جو راز حامد کو معلوم تھا وہ نہ بوڑھی امینہ کو معلوم تھا اور نہ بچّی امینہ کو۔ اسے کچھ وہی جانتا تھا۔ اپنے چمٹے سے خاکی وردی پہنے، لال پگڑی باندھے اور کندھے پر بندوق رکھے سپاہی، جھکی ہوئی کمر پر مشک رکھے بھشتی، کالے چغّے کے نیچے سفید اچکن اور اچکن کی جیب میں سنہری زنجیر ڈالے وکیل اور چمڑے کی جھلّی منڈھی دھپ دھپ کرنے والی خنجری کو اس نے ہرا تو دیا تھا اور اس پر خوش بھی تھا لیکن کچھ کچھ ڈر بھی رہا تھا۔

وہ کبھی اپنے چمٹے کو ایک ہاتھ میں لیتا، کبھی دوسرے ہاتھ میں۔ کبھی اسے اوپر سے پٹک کر زمین پر کھٹ کھٹ کرتا۔ جب وہ اسے عصا کے طور پر استعمال کرتا تو اس کے قدم زمین پر دھیرے دھیرے پڑتے جیسے بوڑھا ہو گیا ہو، جب وہ اسے کندھے پر رکھ کر بندوق کا مزہ لیتا تو اس کے سارے بدن میں تیزی، چستی بھر جاتی اور زمین پر غرور سے تھد تھد پیر

---

[1] اسی عنوان کی پریم چند کی کہانی کا آخری پیراگراف۔ (مصنف)

مارتا آگے بڑھنے لگتا۔

خوشی اور خوف کے جذبوں کے علاوہ اس کے سر میں ایک سودا بھی سمایا تھا کہ کس طرح جلدی سے جلدی گھر پہنچ کر بستہ بوڑھی دادی کو دیدے۔ عیدگاہ میں وکیل صاحب، بھشتی، سپاہی، خنجری اور ان کے مالکوں سے اسے اپنی بحث یاد تھی۔ محمود کے دیے ہوئے کھلونے بھی یاد تھے۔ لیکن اس کے بعد وہ کب ان کے گھیرے سے الگ ہو گیا، یہ اسے ٹھیک سے یاد نہ تھا۔

ہوا یہ تھا کہ اس نے کچی سڑک چھوڑ کر ایک پگڈنڈی پکڑ لی تھی۔ کھیتوں، کھلیانوں، کانٹے بھرے راستوں اور کھابڑ کھوبڑ زمین سے گزرتے ہوئے اسے کئی بار ڈر لگا تھا کہ کہیں وہ راستہ بھول تو نہیں گیا ہے لیکن اسے کچھ کچھ اندازہ تو تھا ہی ــ اور جب اس نے دور سے پیپل کا درخت دیکھا اور پھر اس کے تنے میں رکھی ہوئی شیوجی کی مورتی اور کچھ سوکھے اور کچھ تازہ پھول تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ اب گاؤں پہنچا ہی چاہتا ہے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ سب سے پہلے گاؤں واپس پہنچے گا۔

گاؤں واپس آنے کی خوشی میں جہاں اس کا دل دھڑک رہا تھا وہاں اس دھڑکن میں کچھ کچھ ڈر بھی شامل تھا۔ اسے اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ وکیل صاحب کی لاش گھورے پر پھینک دی جائے گی، بھشتی میاں تھوڑی دیر میں ہی پرلوک سدھار جائیں گے اور سپاہی میاں اپنی بندوق لیے زمین پر آرہیں گے اور ان کی ٹانگ ایسی ٹوٹے گی کہ گولر کے دودھ سے بھی نہیں جُڑ پائے گی لیکن وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ ان سب کا حشر ہونا ہی ہے اور جب ان کا یہ حشر ہوگا تو وہ چاہے جہاں بھی ہوں، چاہے جیسا بھی ہو، سب اس کے چمٹے کو الزام ضرور دیں گے۔

مفتوحوں سے وقار اور خوشامد کا خراج وصول کرنے کے باوجود ڈر تھا کہ اس کا ساتھ نہیں چھوڑ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انہوں نے ہار مان تو لی ہے لیکن وہ سب بھشتی، وکیل، خنجری،

سپاہی ایک نہ ایک دن اس کے چمٹے کو نیچا دکھانے کی کوشش ضرور کریں گے۔ اس نے دو ایک بار پلٹ کر دیکھا بھی تھا کہ کہیں یہ سب اس کا پیچھا تو نہیں کر رہے ہیں۔ حامد نے یہ ڈر اپنی دادی سے چھپا لیا۔ لیکن جب امینہ رونے لگی تو وہ بھی رونے لگا۔ جس طرح حامد اس کے آنسوؤں کے راز کو نہ سمجھ سکا تھا اسی طرح امینہ بھی اس کے آنسوؤں کے راز کو نہ جان سکی تھی۔
لیکن اس نے حامد کو چمٹا لیا اور چٹاچٹ اس کی پیشانی کے بوسے لینے لگی۔

حامد کے عیدگاہ جانے کے بعد امینہ نے ایمان کی طرح بچائے پیسوں میں سے جن میں سے اس نے تھوڑے سے حامد کو دے دیے تھے، آٹھ آنے کی سوئیاں اور چالیس پیسے کا دودھ خرید لیا۔ تھوڑی سی کھانڈ پہلے ہی سے ڈبے میں رکھی ہوئی تھی اور اس نے سوئیاں پکالیں۔
صبح سویرے اس نے گھر میں جھاڑو بہارو کر کے چولھا بھی پوت دیا تھا۔ کچھ تو تازی پکی سوئیوں کا سوندھا پن اور کچھ لپے پتے چولھے کی خوشبو، حامد کی بھوک ایک دم جاگ اٹھی۔
اس نے امینہ سے کہا: "دادی آج تم نے سوئیاں پکائی ہیں؟"

"ہاں میرے پوت۔" دادی نے کہا۔ "میں ابھی دیتی ہوں"۔ اور جلدی سے پتیلی چولھے کے اوپر سے اتار کر زمین پر رکھ دی۔ برتنوں کی ٹوکری پھوس کی چھت میں دھنی سے لٹکی تھی اس نے ایک ہاتھ سے گھٹنے پر زور دیکر اٹھنا چاہا تو پیر ڈگمگائے۔
لیکن لمبا سا چمٹا ہاتھ میں تھا اسی کو ٹکا دیا اور کھڑی ہوگئی۔ ٹوکری میں سے ایک پرانی کٹوری جسے مانجھ مانجھ کر اس نے خوب چمکا دیا تھا نکالی اور اس میں بہت سی سوئیاں انڈیل دیں۔
"دادی یہ تو بڑے مزے کی ہے۔" حامد نے کٹوری کی عزت برقرار رکھنے والے چمچے سے سوئیاں کھاتے ہوئے کہا۔

"اور لے لینا بیٹے!" دادی نے کہا اور خوش ہوگئی کہ اس کی محنت سوارت ہوگئی۔
"لیکن تم تو کھا نہیں رہی ہو۔" حامد نے چمچہ کٹوری میں رکھتے ہوئے کہا۔
"تم کھالو۔" امینہ نے کٹوری حامد کے اور قریب کر دی۔

"نہیں دادی، میں نہیں کھاؤں گا، جب تک تم نہیں کھاؤ گی ــ" حامد نے ضد کی ــ آخر بوڑھی امینہ نے حامد کی ضد کے آگے ہار مان کر ایک دوسری کٹوری میں تھوڑی سی سوئیں انڈیل لیں۔ لیکن گھر میں چمچہ ایک ہی تھا۔ وہ کھاتی کیسے ؟

حامد امینہ کو سوئیاں انڈیلتے دیکھ کر ہی خوش ہو گیا تھا اور اس نے دوبارہ سوئیاں کھانا شروع کر دی تھی۔ اس نے دادی کو کٹوری سامنے رکھے خاموش بیٹھے دیکھا تو سمجھ گیا کہ چمچہ تو ایک ہی ہے دادی کھائے گی کیسے، اس نے کہا : "ایک چمچہ سوئیں میں کھاؤں گا ایک تمھیں کھلاؤں گا۔"

"میرے لال ــ" امینہ کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

ابھی حامد چمچہ میں سوئیں لے کر امینہ کی طرف بڑھا ہی رہا تھا کہ دروازہ اپنے آپ پاٹوں پاٹ کھل گیا اور خنجری کی دھپ دھپ کی آواز فضا میں گونجی۔ خنجری کے دو ہاتھ بھی تھے اور دو پاؤں بھی اور وہ دھپ دھپ کرتی ان دونوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے پیچھے بہشتی میاں تھے، کمر جھکی ہوئی اور اس پر پانی سے بھری مشک لادے ہوئے۔ ان دونوں کے پیچھے وکیل صاحب تھے۔ شیروانی پر کالا کوٹ ڈالے ــ اور سب سے آخر میں سپاہی تھا، کندھے پر بندوق دھرے۔

یہ چاروں دادی پوتے کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ خنجری نے ایک بار پھر دھپ دھپ کی تو وکیل صاحب نے ایک قدم آگے بڑھ کر امینہ سے کہا :

"تمھارے حامد نے مجھے قتل کر کے میری لاش گھورے پر پھینک دی تھی۔"

"اور میری ٹانگ توڑ دی اور وردی پھاڑ ڈالی ــ" سپاہی بولا۔

اس نے اپنے الزام کے ثبوت میں ہوا میں ایک فائر داغا تو حامد اور اس کی دادی ڈر کے مارے کانپنے لگے۔ خنجری نے ایک بار پھر دھپ دھپ کی۔

حامد نے میرا پیٹ پھاڑ ڈالا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا وکیل صاحب —" حامد نے ڈرتے ڈرتے کہا۔
"نہیں، تم نے ہم کو قتل کیا ہے۔" وکیل صاحب نے کہا اور خنجری نے پھر دھپ دھپ کی۔
"حامد نے ہم سب کو قتل کیا ہے۔"
اور بھی جملہ ساری خنجریوں نے دور دور تک دُہرایا۔ "حامد نے ہم سب کو قتل کیا ہے۔"
امینہ نے رو رو کر اپنے پوتے کی بے گناہی کی قسمیں کھائیں تو وکیل صاحب نے اپنی بساط بچھائی۔
"کیوں حامد کیا تو نے یہ نہیں کہا تھا کہ چاہوں تو اپنے چمٹے سے چھرے کا کام بھی لے سکتا ہوں ؟"
"ہاں میں نے کہا تھا۔" حامد نے جو دادی کی ٹانگوں کے سہارے کھڑے ہونے کے باوجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔ جواب دیا۔
وکیل صاحب خاموش ہو گئے۔ اب انہوں نے اگلا پانسہ پھینکا۔
"کہا تو نے نہیں کہا تھا کہ میرا دست پناہ چاہے تو خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے۔؟"
"ہاں! یہ بھی میں نے کہا تھا۔"
یہ جواب سُن کر وکیل صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ انھوں نے فوراً دوسرا سوال داغ دیا۔
"کیا تو نے سپاہی کو یہ کہہ کر دھمکی نہیں دی تھی کہ "یہ بے چارے رستم ہند کو پکڑیں گے؟ —— اچھا لاؤ ابھی مقابلہ ہو جائے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بچّہ کی ماں مر جائے گی۔ پکڑیں گے کیا بے چارے؟"
"ہاں! میں نے یہ بھی کہا تھا —" حامد جھوٹ کیوں بولتا اسے اندازہ بھی نہ تھا کہ وہ وکیل صاحب کے جال میں پھنستا جا رہا ہے۔

حامد کی زبان سے جرم کا اقرار [illegible] یں صاحب کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اب انھوں نے آخری اور [illegible] ملہ کن داؤں [illegible]

"کیا تم [illegible] نہیں کہا تھا کہ وکیل صاحب کرسی پر بیٹھیں گے تو میرا دست پناہ انھیں زمین پر پٹک دے گا۔ اور سارا قانون ان کے پیٹ میں ڈال دے گا۔؟"

"یہ میں نے ضرور کہا تھا۔"

اب حامد اس سارے ڈرامے کو مذاق سمجھنے لگا۔ اسے وکیل صاحب کے اس حشر پر ہنسی آ گئی۔

حامد کو ہنستا دیکھ کر وکیل صاحب کو جیسے غصہ آ گیا۔

"ایک تو تو نے قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اوپر سے ہنس رہا ہے۔" وکیل صاحب گرجے۔

حامد نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر دیکھے۔ اس میں قانون تو کیا کچھ بھی نہ تھا۔ وکیل صاحب کو حامد کی معصومانہ ادا بھی ایک آنکھ نہ بھائی اور بولے۔

"ہاتھ کیا دیکھ رہا ہے ؟"

"دیکھو امینہ، حامد نے تمھارے سامنے اقبال جرم کیا ہے۔ اس سے بڑی اور کیا گواہی ہو سکتی ہے۔؟" انھوں نے گویا فیصلہ سنایا اور سپاہی کو اشارہ کیا۔

"حامد کو گرفتار کر لو اور آلۂ قتل اپنے قبضہ میں لے لو۔ حامد کے اقبالِ جرم کے تم سب گواہ ہو۔"

اپنی کامیابی کی خوشی میں اس کا سینہ پھول گیا تھا۔ انہوں نے ایک فاتح کے انداز میں خنجری، سپاہی، بھشتی، امینہ اور حامد پر نظر ڈالی اور دوسرا حکم داغ دیا۔

"امینہ بھی گرفتار کر لی جائے۔ قتل کے مجرم کو پناہ دینے کے الزام میں۔"

سپاہی نے جھٹ آگے بڑھ کر حامد اور امینہ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

حامد اور امینہ روتے اور چلاتے رہے لیکن ان کی آواز خنجری کی دھپ دھپ میں دب گئی۔

خنجری کہتی " حامد قاتل ہے۔ امینہ نے قتل کے مجرم کو پناہ دی۔" تو ساری خنجریاں دھپ دھپ کر کے اس اعلان کو دہرائیں اور اپنی بے گناہی کا اعلان کرنے والوں کی آوازیں خود ان کے کانوں تک نہ پہنچ پاتیں۔

اس کے بعد حامد اور امینہ کی آواز پھر کبھی نہ سنائی دی۔

اور بہت دنوں بعد ان سب کو حامد کے چمٹے کی یاد آئی اور اس کے سہارے حامد اور امینہ کی بھی۔ ہوا یوں کہ حامد کا چمٹا کیا ٹوٹا کہ نوروں کی روٹیاں جلنے لگیں۔ روٹیوں کو بچانے کی کوشش میں ہاتھ جل گئے، کہیں چھالے بہہ کے پھوٹ نکلے، کہیں گہرے زخم بن گئے اب ان سب نے حامد، اس کے چمٹے اور امینہ کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ امینہ اور حامد تو نہیں ملے ہاں ان کا چمٹا ضرور مل گیا۔ بیچ سے ٹوٹا ہوا۔ ایک ٹکڑا عیدگاہ کے ایک کونے میں پڑا تھا اور دوسرا بہت دور دوسرے کونے میں۔ لیکن یہ کام آسانی سے نہیں ہو گیا۔ بہت سے لوگوں نے مل کر یہ کام بہت دنوں بلکہ مہینوں اور برسوں کیا تب لوہے کے یہ لمبے لمبے ٹکڑے جو برف سے زیادہ ٹھنڈے تھے وہ تلاش کر سکے۔ اب انھیں ان ٹکڑوں کو جوڑنے کی فکر ہوئی، بھٹی دہکائی گئی، سب نے مل کر دھونکنی کی مدد سے بھٹی کی آگ کو خوب لپکایا۔ لیکن چمٹے کے دونوں کنارے، جہاں سے وہ پہلے کبھی جڑے تھے، پھر ایک نہ ہوئے۔

پھر ان لوگوں نے ان دونوں ٹکڑوں کو اپنے سینوں سے لگایا، ان پر محبت سے ہاتھ پھیرا تو چمٹے کے دونوں بازوؤں کے سرے چمک اٹھے۔ ان میں گرمی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لیکن ابھی گرمی، دلوں کی گرمی اتنی نہ تھی کہ حامد کا چمٹا جڑ کر پھر سے ایک ہو جاتا۔ اب وہ سب ایک دوسرے کے دلوں کی گرمی کی تلاش میں نکلے ہیں کہ اسے ایک جگہ جمع کر کے حامد کا چمٹا جوڑ دیں۔

■■

ایک بے نام کہانی

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ایک گھر کے دروازوں کو دیکھ رہا تھا۔ صبح سے اس سے کسی نے کوئی کام کرنے کو کہا ہی نہ تھا۔

اسی وقت اس کے سامنے والے مکان کا دروازہ کھلا۔ اندر سے ایک ہاتھ باہر نکلا اور دو انگلیوں کے درمیان دبی ہوئی کوئی چھوٹی سی چیز اس کے ہاتھ پر رکھ دی گئی۔

" اس رنگ کے بٹن تو لا دے، بالکل اتنے ہی بڑے۔"

اس نے دیکھا رکمنی دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے بلاؤز کو گلے کے پاس ہاتھ سے دبائے ہوئے۔

وہ سیدھا بازار کی طرف چل دیا، تقریباً دوڑتے ہوئے۔ رکمنی کو دفتر جانا ہے۔ جلدی سے بٹن لا دوں نہیں تو اسے دیر ہو جائے گی۔ اس وقت تک تو وہ ہر روز چلی جاتی تھی۔

وہ بٹن لے کر لوٹا تو رکمنی اسی طرح دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ دروازہ بس ذرا سا کھلا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بٹن لے لیے اور دروازہ بند کر لیا۔

" آفس جانے کی جلدی ہے نا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ تبھی دروازہ پھر کھلا۔

" میں جا رہی تھی تم یہیں کھڑے ہو گے ــــ ذرا دوڑ کے دیکھ آؤ، تیرہ نمبر کی بس گئی تو نہیں۔"

وہ بھاگم بھاگ چوراہے کی طرف دوڑا جہاں تیرہ نمبر کی بس کھڑی ہوتی تھی۔ وہاں ابھی چار پانچ لوگ ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے ٹھیک سے کیو بھی نہیں بنایا تھا۔ بس ذرا آگے پیچھے کھڑے تھے، ایسے کہ بس آجائے تو ہر ایک کو معلوم رہے کہ لائن میں اس کا کون سا نمبر ہے۔

"یہاں تو پندرہ بیس آدمی اور عورتیں اکٹھا ہوجاتے ہیں تب بس آتی ہے۔" اس نے سوچا اور الٹے پاؤں واپس لوٹا۔

"ابھی نہیں ۔۔۔ ابھی تو دیر معلوم ہوتی ہے ۔۔" اس نے سانسیں درست کیں۔

"ابھی تو بس تین چار ہی لوگ ہیں۔"

دروازہ پھر بند ہوگیا۔

وہ دروازے کے پاس ہی کھڑا رہا۔ دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھنے ہی جا رہا تھا کہ سامنے والے مکان سے اظہر میاں نکلے۔ تیزی سے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کو فوراً کہیں پہنچنا ہے۔ پھر سڑک پر پہنچ کر رک گئے۔ جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔

پلٹے ۔۔۔ اسی وقت ان کی نظر اس پر پڑی۔

"ادھر۔ ادھر۔ میں کہتا ہوں ادھر ذرا جلدی سے۔"

اس نے رفتار تیز کر دی۔

"یہ پرچہ سیم صاحب کو دے آ۔ اور ہاں ان سے کہدینا کہ اس میں جو لکھا ہے وہ ضرور کرلیں۔"

وہ کھڑا کھڑا انھیں ٹکرٹکر دیکھتا رہا۔

"سمجھ گیا نا" ۔۔۔ انھوں نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھے۔ دو قدم چل کر انھوں نے پلٹ کر دیکھا وہ اسی جگہ کھڑا انھیں دیکھ رہا تھا۔

"تو ابھی گیا نہیں ۔۔۔ جلدی جا۔"

اظہر میاں ابھی جملہ پورا کرنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ ان کے مکان کی طرف ڈگ بھرنے لگا۔

انھوں نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا اور اسے اپنے مکان کے دروازے کے پاس دیکھ کر اپنی رفتار تیز کرلی۔

دروازہ ذرا سے دھکے میں کھل گیا۔

"صاحب نے دیا ہے۔ کہا ہے وہ کرلینا جو لکھا ہے۔"

"ایسے گھور گھور کے کیا دیکھ رہا ہے۔" دروازہ کے پاس سے بیگم صاحبہ نے کہا۔ "اور آواز بھی نہیں دی، دروازہ بھڑ سے کھول دیا۔" یہ کہہ کر انھوں نے غصہ سے دروازہ بند کرلیا۔

وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

رام بابو کے گھر میں اس وقت کوئی اور نہیں تھا۔ بیوی کسی ملنے والی کے یہاں گئی تھی اور بچے اسکول۔ شہر میں ان دنوں چوریاں دن دہاڑے ہو رہی تھیں۔ پہلے انھیں خیال ہی نہیں آیا، نہیں تو بیوی سے کہدیتے جلدی لوٹ آنا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سارا دن گھر خالی رہے۔ پہلے انھوں نے سوچا کہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ انتظار کرلیں لیکن پھر یکایک یاد آگیا کہ بارہ بجے سے پہلے انھیں پہنچنا ضروری ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں الجھتے رہے۔ پھر دروازہ کھول کر باہر آگئے۔ سامنے دیوار سے ٹیک لگائے وہ بیٹھا سر کھجا رہا تھا۔ انھوں نے اسے دیکھا تو ایک خیال ان کے دماغ میں بجلی کی طرح کوندا۔

"اے۔" انھوں نے پکارتے پکارتے اس کا نام یاد کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن نام یاد نہ آیا، اور آتا بھی کیسے، معلوم ہوتا تب نا۔

یہ دیکھ کر وہ منھ دوسری طرف کیے پہلے کی طرح بال کھجا رہا ہے انھوں نے اسے زور سے آواز دی۔

"اے۔"

وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور تیز تیز قدم چلتا رام بابو کے پاس پہنچ گیا۔

"تو کہیں جائے گا تو نہیں۔؟"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔

"بیبی جی کو جانتا ہے نا؟"

وہ خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔

"بی بی جی کو نہیں جانتا؟"

اس نے سر ہلایا ــ جانتا ہے ــ خوش ہو گئے۔

"یہیں کھڑا رہ۔" انھوں نے کہا۔ "میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اپنے گھر میں گھس گئے اور پھر ذرا سی دیر میں باہر نکلے ــ دروازہ میں تالا ڈالا، چابی اس کی طرف بڑھائی اور بولے۔

"یہیں دروازہ پر بیٹھا رہ ـــــ دیکھ کہیں جانا نہیں ــ بی بی جی جب آئیں تو چابی انھیں دے دینا۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر چابی لے لی۔

"دیکھ کہیں جانا نہیں ــ، ہلنا نہیں یہاں سے۔"

وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔"

"کہیں جائے گا تو نہیں۔؟" انھوں نے ایک بار پھر پوچھا اور یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ وہ ان کی بات سمجھ گیا ہے، انھوں نے قدم آگے بڑھائے۔ سڑک پر پہنچ کر انھوں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ان کے مکان کے دروازہ کے پاس پھسکڑا مارے بیٹھا تھا اور گردن جھکائے ہوئے سر کھجا رہا تھا۔ انھیں اطمینان ہو گیا۔

کسی کو اس کا نام معلوم نہ تھا۔ کوئی بھولو کہتا ــ کوئی ننّھا۔ زیادہ تر لوگ "اے" "ارے" سے کام نکال لیتے۔ یہ بھی کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں سے آیا تھا۔ رات کو پاس

والی دوکان کے پٹرے پر سو رہتا۔ کسی گھر سے دن میں بچا کھچا کھانا مل جاتا، کسی گھر سے رات میں۔ کبھی کبھی کوئی رحم کھا کر بغیر کنڈے کی پرانی پیالی میں اسے چائے دے دیتا۔ چائے کبھی کبھی تو ٹھنڈا پالا ہوتی۔ لیکن گرم ہو یا گنگنی وہ اسے پیتے ہوئے زور سے "سو" کی آواز ضرور نکالتا۔ کسی گھر میں کوئی مہمان رات برات آجاتا یا کسی اور وقت تو اس کا سامان گھر تک پہنچا دیتا لیکن اپنا کام پورا کرنے کے بعد مزدوری یا انعام کی لالچ میں ایک منٹ نہ رکتا۔ ویسے کوئی دس بیس پیسے یا چونی اٹھنی دے دیتا تو وہ انکار بھی نہ کرتا۔ ان پیسوں کو خرچ کرتے کسی نے اس کو کبھی دیکھا نہ تھا۔ البتہ جب آس پاس کے مکانوں کے بچے اسکول جانے یا لوٹ کے آتے اور کسی کا بستہ بہت بھاری ہوتا تو دوڑ کر ان کا بستہ لے لیتا اور جیسے اس سے کام لینے کا انعام دینے کے لیے ایک انگریزی مٹھائی ان کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ پھر ایک انگریزی مٹھائی اپنے منہ میں ڈال کر ایسی آوازیں نکالتا جیسے خوب مزا لے رہا ہو۔

اسے یہاں آئے بس تین چار مہینے ہوئے تھے۔ وہ ان آٹھ دس مکانوں میں رہنے والوں کے کام کب سے کر رہا تھا اور یہ کہ سب سے پہلے اسے کھانا کس گھر سے ملا تھا یہ نہ انھیں یاد تھا نہ اسے۔

وہ کسی کام پر پابند نہ تھا۔ کوڑا کرکٹ گھورے پر پھینکنا ہو، سڑک پار دھوبی کے مکان سے کپڑوں پر استری کرانا ہو، کسی کو رات برات یا دن میں بھی بیڑی سگریٹ کی ضرورت پڑ جائے سامان رکشہ تک پہنچانا، زینے پر جھاڑو دینا ہو، غرض کوئی بھی چھوٹا موٹا کام ہو اسے جیسے ہی پکارا جاتا وہ حاضر ہو جاتا۔

دونوں وقت اسے پابندی سے کھانا ملتا ہے یا نہیں، یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ کسی نے اس کے بارے میں اتنا سوچا بھی نہ تھا۔ ہاں وہ کبھی کبھی اس کی عادتوں کا مذاق ضرور اڑاتے تھے۔ مثلاً یہی کہ جب وہ کھانا کھانے بیٹھتا تو وہ دو کتے جو رات کو دوکان کے پٹرے کے نیچے اس کے پاس سوتے بھی تھے، پاس آکر کھڑے ہو جاتے اور وہ ایک نوالہ خود کھانے کے

بعد ایک ایک نوالہ ان کی طرف بھی بڑھا دیتا ہے۔ رام بابو نے جب پہلے پہل اسے یہ کرتے دیکھا تھا تو زوردار ڈانٹ پلائی تھی۔ ڈانٹ سن کر وہ انھیں ٹکر ٹکر دیکھتا رہا تھا۔ پھر اس نے اخبار کا وہ ٹکڑا جس میں دو تین باسی روٹیاں اور تھوڑی سی سوکھی ترکاری تھی کتّوں کی طرف بڑھا دیا تھا۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر ہنستے ہنستے رام بابو کے پیٹ میں بل پڑ گئے تھے، انھوں نے یہ کہانی اپنی بیوی کو سنائی تھی، بیوی نے بچّوں کو، بچّوں نے محلّے کے دوسرے بچّوں کو اور اس طرح یہ بات سارے گھروں میں پھیل گئی تھی۔ اس دن سے دو ایک لوگوں نے اسے "کتّے والا" کے نام سے پکارنا شروع کر دیا تھا لیکن شاید انھیں اس نام کے آدمی سے کام لینا اچھا نہیں لگا اور وہ اسے دوبارہ "بھولو" "ننھّا" یا "اے" "ارے" کہہ کر پکارنے لگے۔ اسے نہ نئے نام پر اعتراض تھا نہ پہلے کے ناموں پر، نہ کوئی نام پسند تھا نہ ناپسند۔

وہ ان چار چھ مکانوں کے آس پاس موجود تو ہر وقت رہتا تھا لیکن لوگوں کو یاد تب ہی آتا تھا جب انھیں کوئی کام ہوتا۔ وہ اس بات سے بھی نہ خوش تھا نہ ناخوش۔

پھر ایک دن شام کے وقت جب لوگ دفتروں یا اپنے کام کے ٹھکانوں سے آ گئے تھے یا بس آنے ہی والے تھے اور بچے گھروں میں شور وغل مچا رہے تھے کہ تھوڑی دیر بعد انھیں پڑھنے کے لیے بیٹھ جانا تھا اور عورتیں چائے بنا رہی تھیں یا پی رہی تھیں یا اپنی دن بھر کی پریشانیوں کی کہانی کام پر سے آرام کر کے آنے والے شوہروں کو سنا رہی تھیں یا پھر ان کی ڈانٹ پھٹکار سن رہی تھیں کہ ایک مکان سے کسی نے کسی کو پکارا۔

ہوا یہ تھا کہ ایک کانسٹبل اور ایک ہیڈ کانسٹبل نے کسی کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور مالک مکان کے باہر آنے پر اس سے پوچھا تھا۔

"آپ کے یہاں چوری ہوئی ہے"

"میرے یہاں ___ نہیں تو ___ دیکھیے پوچھتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ غڑاپ سے گھر کے اندر چلا گیا تھا۔

اور اس نے گھر میں جا کر پوچھنے کے بجائے کسی پڑوسی کو آواز دی تھی۔ اس نے دو سپاہیوں کو دیکھا تو دوسری طرف کے مکان کے کرایہ دار کو بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا اور دھیرے دھیرے ان مکانوں کے سارے مرد، کچھ بچے اور دو ایک عورتیں بھی باہر نکل آئی تھیں لیکن کسی نے صاف صاف نہیں کہا کہ اس کے یہاں چوری نہیں ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہوئی ہو اور انھیں معلوم نہ ہو۔ باری باری ہر ایک نے اپنے اپنے گھروں میں جا کر خوب جانچ پڑتال کی لیکن باہر نکل کر بس یہی کہا ـــ

"معلوم تو نہیں ہوتا۔" یا پھر اسی قسم کا کوئی جملہ۔

"کسی نے کسی اجنبی کو یہاں آتے جاتے تو نہیں دیکھا؟" کانسٹبل نے بھل منساہٹ سے پوچھا۔

"کسی اجنبی کو؟"

سب نے ایک دوسرے کے چہرے دیکھے۔ اسی وقت ایک دم جیسے سب کو یاد آیا کہ 'وہ' بھیڑ میں موجود نہیں ہے۔ نہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا سر کھجا رہا ہے، نہ کسی دروازہ کے پاس کھڑا ہے، نہ اسے کسی نے کسی کام سے بھیجا ہے۔

"کوئی اجنبی تو شاید نہیں آیا ـــ لیکن 'وہ' نہیں ہے۔" آخر ایک صاحب نے اپنے دل کا چور ظاہر ہی کر دیا۔

"وہ کون ـ" ہیڈ کانسٹبل نے ذرا اونچی آواز میں پوچھا۔

"وہ 'وہ'"

ابھی جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا پایا تھا کہ کسی نے لقمہ دیا۔

"کتے والا ـ"

"کتے والا ـ؟ اب ہیڈ کانسٹبل کو سچ مچ غصہ آنے لگا تھا۔

"ہاں داروغہ جی" کسی نے ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے ہیڈ کانسٹبل کا رتبہ بڑھا دیا۔

"وہی کتے والا ـ"

ہیڈ کانسٹبل کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ۔ ''

" ہم اسے "کتّے" والا بھی کہتے ہیں۔ کسی نے اس خیال سے کہ اسے پھر سے غصہ نہ آجائے رسان سے کہا " وہ اپنا کھانا "کتّے" کو کھلا دیتا ہے ۔''

سپاہی ہنسا لیکن اپنے صاحب کو خاموش دیکھ کر ایک دم چپ ہو گیا ۔

"جن صاحب نے رپورٹ لکھائی ہے وہ کہاں ہیں ؟'' ہیڈ کانسٹبل نے پوچھا ۔

ہر ایک نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ۔

" رپورٹ ؟'' کسی نے مکانوں کے جو لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے ان سے بھی پوچھا اور سپاہیوں سے بھی ۔

" آپ میں سے کسی نے رپورٹ نہیں لکھائی ؟''

سب نے پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا ۔

"پرانا محلّہ یہی ہے نا ۔؟''

"پرانا محلّہ ــــ !'' نہیں داروغہ جی' "پرانا محلّہ'' تو ادھر ہے' ذرا آگے بڑھ کر سڑک کی دوسری طرف' گلی سے لگا ہوا ' یہ تو " نیا محلّہ'' ہے ۔

ہیڈ کانسٹبل نے ہنستے ہوئے کہا اور وہ دونوں سڑک کی طرف بڑھے تو " نیا محلّہ'' کے لوگوں کی بھیڑ چھٹنے لگی ۔

سب اپنے اپنے گھروں میں لوٹ آئے' لیکن ہر ایک نے اپنے اپنے مکان کا ایک ایک کمرہ بجلی جلا کے دیکھا ۔ بیوی بچّوں سے کہا کہ خوب اچھی طرح دیکھ لیں کوئی چیز کم تو نہیں معلوم ہو رہی ہے ۔

کوئی چیز کسی مکان میں کم نظر نہ آئی ۔ ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی ۔ پھر بھی لوگوں نے اپنے اپنے گھروں میں ایک دوسرے سے یہ ضرور معلوم کرنے کی کوشش کی کہ " کتّے والا کب سے نظر نہیں آیا ہے ۔'' اس وقت کسی کو اس کا دوسرا نام یاد ہی نہ آیا ۔ تھوڑی دیر تک تو اس

واقعہ کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں، پھر سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا۔ بس دلوں میں ایک کسک سی رہ گئی

رات ذرا اور ڈوبی تو رکمنی نے بچا کھچا کھانا ایک پرانے اخبار پر رکھا اور دھیرے سے دروازہ کھولا۔ اسے یاد بھی نہ تھا کہ وہ بہت دیر سے نظر نہیں آیا تھا۔ سیڑھی کے کونے پر گردن جھکائے ہوئے وہ اپنا سر کھجا رہا تھا۔

" اے " اس نے کہا اور ہاتھ بڑھا کر کچھ کچھ ڈرتے ہوئے اخبار کا گولا اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور پوچھا۔

"کہاں چلا گیا تھا؟"

اس نے دھیرے دھیرے نظریں اٹھائیں، لیکن بیٹھا اسی طرح رہا، بولا بھی کچھ نہیں۔

وہ دروازہ بند کرنے لگی تو اس کی نظر سامنے والی کھڑکی پر پڑی جہاں سے رام بابو ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اظہر میاں نے ہانک لگائی۔

"ارے ـــ سنتا ہے۔ ادھر دیکھ، ہاں ہاں ادھر، دروازے کی بجلی بجھا دے۔"

ان کی آواز ذرا کڑک دار تھی۔ کئی کھڑکیاں کھلیں اور بند ہو گئیں۔ اس کے لوٹ آنے کی خبر سب کو ہو گئی تھی۔

رکمنی نے سونے سے پہلے ایک ایک کمرہ میں جا کر پھر بجلی جلائی۔ کونوں کھدروں کو بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھا اور سارے کمروں میں تالے ڈال دیے۔ شاید دوسروں نے بھی یہی کیا ہو۔

وہ دھیرے دھیرے اٹھا اور اس نے اظہر میاں کے مکان کے باہر والے پندرہ واٹ کے بلب کا سوئچ آف کر دیا ـــ نیا محلہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔

▬▬

میرا، تیرا، اس کا غم

(کرشن چندر جی کے نام)

باہر کی ساری دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ سڑک وہی تھی لیکن ذرا زیادہ کشادہ۔ پیدل چلنے والوں، سائیکل سواروں، اسکوٹروں اور موٹر سائیکلوں پر پلک جھپکتے نظروں سے اوجھل ہو جانے والی اور خوبصورت کاروں پر تنہا، دوستوں، عزیزوں اور محبوباؤں کے ساتھ سفر کرنے والوں کی بھیڑ اتنی ہی تھی جتنی ہمیشہ ہوتی تھی بلکہ شاید اس سے بھی کچھ زائد۔ لیکن ہر ایک چہرہ جیسے خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔

میں نے یہ سوچ کر کہ وہ ہوٹل جہاں میں دفتر سے اٹھ کر کبھی کبھی دن میں کھانا کھانے چلا جاتا ہوں اتنی دور تو ہے ہی کہ ایک سگریٹ کا لطف لیا جا سکے، سامنے والی پان کی دوکان کا رخ کیا تو حیران رہ گیا۔ بغیر لگے پانوں کی ڈھولیاں ایک طرف سلیقے سے جمی ہوئی تھیں، کتھے چونے کے برتن جھماجھم چمک رہے تھے، سنگِ مرمر کی وہ سِل جس پر پان لگا کر پھیلا دیے جاتے تھے، پانوں کی سبزی کے نیچے بلکہ پیچھے سے سفیدی جھلکا رہی تھی۔ دوکان کا مالک اور ملازم صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ دو تین خریدار جو پہلے سے موجود تھے اور ایک خریدار جو میرے بعد آیا تھا نہایت عمدہ کپڑے پہنے تھے۔

دوکاندار نے بجد سلیقہ سے پان لگایا، الائچی ڈالی اور خوبصورت سا بیڑا بنا کر ایک گاہک کے حوالے کیا تو اس نے ایک سکّہ اس کی طرف بڑھا دیا اور روانہ ہو گیا۔

"بابوجی۔" دوکاندار نے آواز دی۔

"پیسے۔؟"

"پیسے دے تو دیے۔"

"جی ہاں، لیکن باقی تو لیتے جائیے۔"

وہ واپس لوٹا ـــــ دوکان دار نے باقی پیسے اس کے ہاتھ میں رکھ دیے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا اور دوکان دار نے مجھے حیران و پریشان دیکھ کر پوچھا۔

"بابوجی پان؟"

"نہیں، سگریٹ۔"

"کون سی؟"

میں نے اپنی بلکہ اپنی جیب کی پسند کی سگریٹ کا نام لیا۔

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"اب کہاں ـــ فلٹر لیجیے۔"

"لیکن ـــ"

"وہ بھی اتنے ہی میں ہے۔" اس نے کہا۔

میں نے اتنے ہی پیسے دیے، فلٹر سگریٹ لی۔ دوکان کے اس کونے کی طرف جہاں ایک سلگتی ہوئی رسّی سگریٹ جلانے کے لیے لٹکی رہتی تھی بڑھا تو وہاں رسّی کے بجائے طاق میں ایک خوبصورت سا لائٹر رکھا تھا۔ میں نے سگریٹ جلائی۔ لائٹر کو ایک بار ہتھیلی میں رکھ کر دیکھا اور ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔

اب میں کچھ کچھ الجھنے لگا تھا۔ ہر شخص خوش و خرم تھا، مسکرا رہا تھا، ایک دوسرے سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے مایوس ہو کر پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو سنّاٹے میں

آ گیا۔ پیشانی کی دبیز لکیریں غائب تھیں۔ میں نے یہ سوچ کر کہ شاید یہ لکیریں میری پیشانی سے اٹھ کر کسی دوسری پیشانی پر چپک گئی ہوں، اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کسی پیشانی پر اس کا نام و نشان تک نہ تھا۔ آس پاس کی ہر پیشانی صاف اور سپاٹ تھی بلکہ خوشی سے دمک رہی تھی۔

میرے لیے یہ دوسرا صدمہ تھا۔ میں نے یہ لکیریں کتنی فکریں پال پال کر اور کتنی مصیبتیں جھیل جھیل کر اپنی پیشانی پر جمائی تھیں لیکن یہ آج بلکہ ابھی ابھی بغیر کسی سبب کے غائب ہو گئی تھیں اور کربناک ماضی سے میرا سارا رشتہ ہی کٹ گیا تھا۔ پہلا صدمہ مجھے اس وقت ہوا تھا جب میں نے پان کی دوکان پر ان لوگوں کو بھی جو عام طور پر نہایت گندے، میلے چکٹے کپڑے پہنے رہتے تھے صاف ستھرے بلکہ اچھے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تھا اس بات پر مجھے اس قدر حیرت ہوئی تھی بلکہ غصہ آیا تھا کہ میں نے اپنے کپڑوں کی طرف بھی نظر نہ کی تھی۔

میں ان دونوں صدمات سے بوجھل ہوٹل کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک سائکل کا اگلا پہیہ میری ٹانگ سے ٹکرا گیا ــــ میں نے اس جگہ ہاتھ پھیرا جہاں سائکل کا پہیہ ٹکرایا تھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ میرا دایاں ہاتھ نہایت چکنی مکمّن زین کی پتلون پر پھسل رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے جوتوں سے لے کر قمیص تک نظر ڈالی تو کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ میرا جوتا چمکدار، نیا اور بہت خوبصورت تھا، پتلون نہایت عمدہ سلی ہوئی تھی اور اس پر ایک بھی شکن نہ تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کی قمیص مکمّن زین کی پتلون پر بہت اچھی لگ رہی تھی ــــ "یا الٰہی آخر یہ ماجرا کیا ہے؟" ــــ میں نے اپنے آپ سے کہا ــــ اسی دوران میری نظر اپنے ہاتھ کی گھڑی پر پڑی تھی تو اسے پہچاننا بھی مشکل ہو گیا۔ شیشے پر کے نشان تک غائب تھے۔ پٹا سیاہ اور خوبصورت تھا اور فریم بھی جگمگا رہا تھا۔

سائکل سوار نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"مجھے واقعی بہت افسوس ہے۔" اس کی آواز حلق سے نہیں نکل رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں" میں نے کہا تو اپنی ہی آواز مجھے دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی ــــ" اس

موقع پر یہ جواب تو نہیں دیا جاتا۔ "اندھے ہو گئے تھے کیا؟" شاید زیادہ مناسب رہتا لیکن نہ جانے کیسے میرے مونہہ سے "کوئی بات نہیں" نکل گیا۔

میں نے دوبارہ اپنے پتلون کی مہری کی طرف نظر کی تو جس جگہ سائکل کے پہیے نے تقریباً ایک فٹ لمبا نشان بنا دیا تھا وہاں نہ صرف یہ کہ کوئی نشان نہ تھا بلکہ کوئی شکن تک نہ تھی۔ سائکل سوار مسکرایا تو میں بھی مسکرا دیا۔ مجھے اپنی اس مسکراہٹ پر ایک بار پھر حیرت ہوئی۔ میں نے اس مسکراہٹ کو روکنے کی کوشش کی تو ایک بار پھر مسکراہٹ میرے ہونٹوں سے پھوٹ پڑی اور سائکل سوار بھی ہنستا ہوا دوسری سمت روانہ ہو گیا۔

میں نے دو چھوٹی چھوٹی سڑکیں پار کیں اور اس سڑک کی طرف بڑھا جس پر ذرا آگے بڑھ کر وہ ہوٹل تھا جس میں کبھی کبھی دن کا کھانا کھا لیا کرتا تھا کہ ایک دم سامنے جو نظر پڑی تو ایسا لگا کہ جیسے میں اس جگہ پہنچ گیا ہوں جہاں وہ ہوٹل تھا۔ آس پاس کے مکان بلکہ حد یہ ہے کہ پارک تک تھے تو وہی لیکن شاید ان ساری عمارتوں پر ابھی ابھی سفیدی کی گئی تھی۔ پارک میں ہر موسم کے پھول ایک ساتھ کھل رہے تھے، ان میں گلاب بھی تھے، موگرا بھی، گیندے بھی اور برسات کے آخر اور جاڑوں کے شروع میں کھلنے والے موسمی پھول بھی۔

لیکن اس جگہ جہاں ہوٹل ہونا چاہیے تھا ایک خوبصورت عمارت کھڑی تھی۔ دروازوں پر سرخ رنگ کے پردے پھڑپھڑا رہے تھے۔ کھڑکیوں پر بھی رنگ برنگے پردے لٹکے تھے۔ اسی لمحہ دروازہ کے پردے میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور میری بہن نے پردہ میں سے مونہہ نکال کر کہا۔

"بھائی صاحب آئیے!"

اب میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میری چھوٹی بہن تو بمبئی میں رہتی ہے۔ اس کا شوہر وہاں پائلٹ ہے۔ وہاں اس کا ایک چھوٹا سا سجا سجایا مکان ہے۔ لیکن آخر وہ یہاں کیسے آ گئی؟ اس کا مکان یہاں کیسے آ گیا۔ اندر داخل ہوا تو میرے دونوں بھانجے اپنے اپنے کھلونے چھوڑ کر مجھ سے چمٹ گئے۔ چھوٹا ہمک کر میری گود میں آ گیا۔ اور پولو میری ٹانگوں سے چمٹ کر

کھڑا ہوگیا اور بولا ۔

"ماموں جان میری ٹافی کہاں ہے؟ نکالیے جلدی سے ۔"

یہ جاننے کے باوجود کہ میری دونوں جیبیں خالی ہیں، میں نے ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالا تو وہاں بہت سی ٹافیاں موجود تھیں ۔ میں نے ٹافیاں میز پر ڈھیر کردیں تو چھوٹا جھٹ پٹ میری گود سے اترنے لگا اور پولو جواب تک میری ٹانگوں سے چمٹا کھڑا تھا ٹافیوں پر ٹوٹ پڑا ۔ میز کی دوسری طرف کھڑی ہوئی میری بہن مسکرا رہی تھی ۔ ایک کونے میں چند پلیٹیں سلیقہ سے رکھی تھیں ۔ چند پیالوں میں جو ڈھکے ہوئے تھے گرما گرم کھانا رکھا ہوا تھا جس میں سے بھاپ کے ساتھ خوشبو بھی چاروں طرف پھیل رہی تھی ۔

میں نے واش بیسن سے موہنہ ہاتھ دھویا ۔ کرسی کی پشت پر پھیلے ہوئے تولیہ سے ہاتھ پونچھا اور کھانا کھانے بیٹھ گیا ۔ میری بہن نے بھی کھانے میں میرا ساتھ دیا ۔

دفتر واپس پہنچا تو صرف ایک گھنٹہ بیتا تھا جبکہ روزانہ ایک گھنٹے کے بجائے ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے تک لگ جاتے تھے اور دفتر آتے ہی یہ احساس ہونے لگتا تھا کہ جو کچھ کھایا تھا وہ یا تو پیٹ میں پہنچا نہیں تھا یا واپس آنے میں ہضم ہوگیا تھا ۔ کئی لوگ مجھ سے پہلے ہی واپس آچکے تھے ۔ باقی ایک ایک دو دو کرکے آرہے تھے ۔ نہ کسی کے چہرے پر جھلاہٹ تھی نہ کوئی پریشانی ۔ ہم میں سے نہ کسی نے کسی ایسے شخص کی برائی کی جو وہاں موجود نہ ہو، نہ کسی پر جملہ بازی کی، نہ کسی کا دل دکھانے کے لیے کوئی جملہ کہا، نہ کسی کی شکل وصورت کا مذاق ہی اڑایا ــــ حد یہ ہے کہ ہم نے کسی دوسرے کے کام میں غلطیاں بھی نہیں نکالیں ۔

اس دوران جب ہم لوگ کھانے کی چھٹی میں باہر گئے ہوئے تھے، دفتر کی کایا پلٹ ہوگئی تھی ۔ عمارت نو ہی تھی لیکن اسے ہلکے گلابی رنگ سے رنگ دیا گیا تھا ۔ ٹوٹے پھوٹے حصوں کو سیمنٹ لگا کر برابر کردیا گیا تھا، میز کرسیوں پر پالش کردی گئی تھی، بیچ والی میز پر کسی نے گلدان رکھ کر اس میں ایک گلدستہ سجا دیا تھا، باہر لان کی گھاس کاٹ کر برابر کردی گئی تھی، جھاڑ جھنکاڑ اکھاڑ

کر پھینک دیے گئے تھے۔ سارے پودوں کو تراش خراش کر سڈول بنادیا گیا تھا اور ہر ہر پودے پر پھول ٹانک دیے گئے تھے۔

غرض دفتر کے اندر اور باہر ایک ہی سا عالم تھا۔

میں نے اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھا تو وہ میرے کپڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

" کہاں سے سلوائے۔ بہت عمدہ سلے ہیں اور رنگوں کا انتخاب تو بہت ہی خوب ہے۔"

کسی نے کسی کے کپڑوں کی تعریف کی ہو، یہ میرے دفتر میں پہلی بار ہوا تھا ورنہ ہم لوگ تو ایک دوسرے کی برائیاں کرنے کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ اچھے پہلو پر ہماری نظر ہی نہ جاتی تھی۔

"جی شکریہ"۔ میں نے کہا اور سوچا کہ اس کی بش شرٹ اور پتلون کی، جو یقیناً میرے کپڑوں سے اچھی اور بہتر سلی تھی، تعریف کردوں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اس وقت کی تعریف تو اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے والی بات ہوکر رہ جائے گی، خاموش رہ گیا۔ لیکن اس نازک خیال، اس احساس، جذبہ کی اس گہرائی کا تجربہ میں نے پہلے کیوں نہ کیا تھا۔ یہ احساس کھوکھلے لفظ 'شکریہ' سے کس قدر مختلف تھا۔ اسی وقت پسندیدگی کا اظہار نہ کرنے میں بھی کیسی پسندیدگی چھپی ہوئی تھی جس کا احساس الفاظ کے بغیر اظہار کے بغیر دوسروں کو بھی ہوا تھا اور یہ احساس ان کی آنکھوں کی چمک، چہرے کی مسکراہٹ اور بات چیت کے انداز سے ظاہر تھا۔ لیکن یہ سب ایک دم ہو کیسے گیا؟

اب یہ روزانہ کا دستور ہو گیا تھا۔ جہاں جس چیز کی ضرورت ہوتی مل جاتی۔ پیاس لگتی تو کوئی مشروب فوراً مل جاتا، بھوک لگتی تو کسی بھائی، کسی بہن یا کسی دوست کا مکان قریب ہوتا اور لطف یہ کہ میزبان منتظر بھی رہتا۔ گندگی دلوں کے اندر اور دلوں کے باہر کی، جیسے ایک دم غائب ہو گئی تھی۔ دل کدورتوں سے صاف تھے، چہرے غموں سے پاک، آنکھیں مسکراہٹوں سے چمکتی ہوئی اور پیشانیاں تردد سے خالی۔

یہ سلسلہ کئی دن، کئی ہفتے بلکہ کئی مہینے چلتا رہا۔ زندگی خوشیوں سے کچھ اس طرح بھر

گئی تھی کہ اب بہت سی پرانی باتیں یاد بھی نہ رہ گئی تھیں۔ زندگی میں ایسی ترتیب بلکہ خوش ترتیبی پیدا ہوگئی تھی کہ سارے تکون چوکور بن گئے تھے۔ کوئی کسی سے ٹکراتا نہ ٹوٹتا۔ مخالف سمت سے تیز رفتار سے آتی ہوئی گاڑیاں آمنے سامنے آکر اس طرح ایک دوسرے کے قریب سے گذر جاتیں کہ جیسے بس یہی ہونا ممکن تھا۔

ایک دن میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ یکایک نظر جو اٹھائی تو سامنے کرشن چندر کھڑے مسکرا رہے تھے۔ اپنی وہی مسکراہٹ لیے جس میں کچھ غم بھی ہوتا ہے، کچھ خوشی بھی، کچھ امید بھی کچھ ناامیدی بھی، کچھ ماضی بھی، کچھ مستقبل بھی۔

میں ایک دم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھیے تشریف رکھیے۔" میں نے کہا۔

کرشن جی ذرا جھجکے، جیسے بہت جلدی میں ہوں۔ لیکن میں نے اصرار کیا تو بیٹھ گئے۔

دو ہفتہ قبل جس دن ان کا خط آیا تھا میں اسی دن سے ذرا الجھن میں تھا۔ میں نے سوچا کہ جلدی میں کہیں میں وہ بات بھول نہ جاؤں اس لیے خیر خیریت دریافت کرنے کے بجائے میں نے اپنے دل کی الجھن ان کے سامنے رکھ دی۔

"اپنی بہترین کہانیوں کے انتخاب کی اجازت کا شکریہ۔"

وہ مسکرائے۔

"لیکن دو سال قبل آپ نے کہا تھا کہ آپ کو اپنی بہترین کہانیاں تو ابھی لکھنی ہیں ــــ اس بیچ آپ نے ایسا تو کچھ لکھا نہیں۔"

"ہوں۔" کرشن جی نے کہا اور بے چینی سے اپنی کرسی میں کسمسائے ــــ "اب لکھ بھی نہیں سکوں گا۔ مجھے جانا ہے، جلدی ہے۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا ــــ "علاج کرانے کے لیے لندن،

ماسکو یا نیویارک ؟"

"ارے بھائی اچھا ہوتا تو یہیں ہو جاتا، ماسکو یا نیویارک جانے سے حاصل، ہاں مجھے ذرا جلدی ہے۔"

"لیکن آخر کہاں جانے کا ارادہ ہے۔" میں نے ضد کی۔

"ارادہ" ایک مسکراہٹ ان کے چہرے پر بکھر گئی۔ طنزیہ مسکراہٹ۔

"بھئی میں اپنے خواب لینے جا رہا ہوں۔"

"خواب" مجھے ایک دم یاد آیا کہ ادھر کئی ہفتوں، کئی مہینوں سے جو ہو رہا ہے وہ ایک خواب ہی تو ہے اور میں نے کہا۔ " ایک خواب میں نے بھی، ہم نے بھی ادھر ——"

میں جملہ پورا بھی نہ کر پایا تھا کہ کرشن جی کرسی پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

" وہ خواب میں نے ہی بُنے تھے، میں نے ہی بھیجے تھے۔ اب ایسا لگتا ہے یہ خواب بھی دیکھنا مشکل ہو جائے گا۔ میں اسی لیے جا رہا ہوں۔ جب یہ خواب لوٹ آئیں گے تو میں بھی لوٹ آؤں گا۔"

میں بھی کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"لیکن آپ کب تک لوٹیں گے۔ اگلے مہینے، دو چار ماہ بعد، ایک سال، دو سال، یا پنچ سال بعد، کب، آخر کب ؟" میں نے کہا۔

" اب میں نہیں لوٹوں گا۔" انھوں نے کہا۔ " میری جگہ کوئی اور آئے گا کوئی دوسرا ہی، زیادہ سجل، زیادہ سیک، زیادہ خوبصورت، زیادہ بامعنی خواب لے کر۔"

یہ کہہ کر کرشن جی مڑے۔ میں بھی بڑی گول میز کا چکر کاٹ کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ دھیرے دھیرے قدم آگے بڑھایا اور آہستگی سے بولے۔

" دیکھو سہیل خواب دیکھنا کبھی بند نہ کرنا۔ جہاں خواب نہیں ہوتے وہاں اچھی، بڑی حقیقتیں بھی جنم نہیں لیتیں، وہاں ماضی بھی بے معنی ہو جاتا ہے، حال بھی کربناک اور مستقبل بھی

اندھیرا ـــ تاریک اور سیاہ ۔"

انہوں نے میرے شانے پر اپنے ہاتھ سے ذرا زور ڈالا ـــ اور میری آنکھوں میں جھانکا۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اداسی تھی ـــ وہ بولے ۔

"میں اس وقت ذرا جلدی میں ہوں، بلکہ بہت زیادہ جلدی میں ہوں ۔ لیکن تم میری بات اپنی عمر کے اور عمر میں اپنے سے چھوٹے کہانی کاروں تک ضرور پہنچا دینا ۔"

میں نے ہمیشہ چمکتی رہنے والی ان آنکھوں میں اداسی اور حسرت اداسی دیکھی تو آنسوؤں کی ایک لکیر میری آنکھوں میں تیر گئی ۔

کرشن جی نے بڑے پیار سے میرے کندھے پر اپنے ہاتھ سے زور ڈالا، ایک بار مسکرائے اور بولے ۔

"آنسوؤں کے بجائے ان آنکھوں میں خواب بھر لو ۔ اچھا رخصت ۔"

میں اسی جگہ کھڑا انھیں دیکھتا رہا ۔ انھوں نے تھوڑی دور جا کر ایک بار میری طرف پلٹ کر دیکھا اور آہستہ آہستہ اس جگہ تک بڑھتے چلے گئے جہاں آسمان جھک کر زمین سے مل جاتا ہے اور آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ۔ میں نے ایک بار پھر آنسو پونچھنے کی کوشش کی تو انگلیاں پیشانی سے ٹکرائیں اور میں حیران رہ گیا ۔

میری پیشانی کی دبیز لکیریں واپس آ گئی تھیں ۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو سب کچھ پہلے ہی کی طرح تھا ۔ اس خواب سے پہلے کی طرح ۔

■■

رگِ سنگ

آسمان میں بجلی ایک دم سے کڑکی تو سامنے والے مکان کی دوسری منزل سے کسی نے چیخ کے کہا۔

"یہ کیا تھا؟"

سڑک کے اس پار کوئی پچاس ساٹھ فٹ کے فاصلے سے جو اس وقت پچاس ساٹھ کوس کا فاصلہ بن گیا تھا، دوکان کے برآمدے میں اتوار کے بازار کے لیے لائی ہوئی بنچوں پر بیٹھے ہوئے سپاہیوں میں سے ایک سپاہی نے جس کے ہاتھ میں بندوق تھی، جواب دیا۔

"بادل کڑکا ہے ــــ میں بھی پہلے سمجھا تھا کہ فیر ہوا۔"

بندوق سے مسلح سپاہی کے مونہہ سے بجلی کڑکنے کی اطلاع پا کر سوال پوچھنے والا کھڑا تو چھجے پر ہی رہا لیکن اس کے چہرے سے پریشانی غائب ہوگئی ــــــ مگر ذرا فاصلہ پر ڈوانڈر کی طرف رانوں اور دن کو بھی بے روک ٹوک پھرنے والی گایوں اور بھینسوں کے گوبر میں سے جو پانی برسنے سے ذرا پھیل گیا تھا، دانہ چگنے والی فاختہ کا دل نہ فائر کی آواز سے دھڑکا، نہ بجلی کے کڑکنے سے، ہاں جب پاس سے پی۔ اے۔ سی کی ایک گاڑی گذری تو وہ ذرا سا کھسک گئی لیکن انداز کچھ ایسا تھا کہ ٹرک نہ ٹوٹ پھوٹ جائے اس لیے کھسکی جا رہی ہوں۔ لیکن دوسری فاختہ دانہ چگتی فاختہ کو اسی طرح دیکھتی رہی۔ ٹرک گذرنے کا اس نے

کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ پھر گلی سے دو سپاہی نکلے تو دونوں اڑکر بجلی کے تار پر بیٹھ گئیں ۔
سپاہی جب ذرا دور نکل گئے تو پھدک کے دونوں ہی گوبر کے پاس آکر بیٹھ گئیں ۔

جس گلی سے تھوڑی دیر پہلے سپاہی نکلے تھے اسی گلی کے کونے سے شکوّ نے تھوڑا سا چہرہ، تھوڑا سا بدن نکال کر دونوں طرف دور دور تک سنسان پڑی سڑک پر نظر دوڑائی اور سامنے بیٹھے ہوئے سپاہی کو دیکھتے ہی تیز تیز قدموں سے گلی میں لوٹ گئی ۔

شکوّ صبح دودھ لینے آتی اور برتنوں کی قطار میں اپنی پیالی رکھتی تو ننھا دودھ والا کہتا:

"نہیں دیتا دودھ، جا فضلو کے یہاں سے لے لے ۔"

شکوّ مسکراتی ۔ " دے دے چار آنے کا دودھ ۔"

"کہہ تو دیا نہیں دیتا ۔" دودھ والا غصّہ سے کہتا ۔

شکوّ ہنس دیتی ۔

شکوّ کی ہنسی ایسی تھی جیسے کوئی تھوڑے سے گڑ میں بہت سا نمک گھول دے ۔

ایک تو خدا نے اسے بدصورت بنانے میں یونہی فیاضی سے کام لیا تھا، اس پر جب وہ ہنستی تو اس میں انسان کی فیاضی بھی شامل ہو جاتی۔ رنگ کالا تھا تو ہوا کرے، نخاس کے بازار میں پاؤڈر کے پرانے ڈبّوں میں تھوڑا سا سنگ جراحت، تھوڑا سا میدہ، تھوڑی سی خوشبو اور تھوڑی سی کھریا ملا کر تیار کیا جانے والا سپاہی یار پاؤڈر کس کے لیے بکتا تھا۔ بارہ آنے کا یہ ڈبّہ کئی کئی مہینوں کے لیے کافی ہوتا ۔ اس سے چہرے کا کالا رنگ تو کچھ نہ کچھ چھپ جاتا لیکن گردن اور اس بلاؤز سے، جو کبھی نہ جانے کس کے لیے سیا گیا تھا، لمبے لمبے ہاتھ اور شکوّ کا پیٹ بہت اوپر تک دکھتا تو ـــــ آخر کوئی پاؤڈر پورے بدن پر پوتے تو سارا ڈبّہ ایک ہی دن میں ختم نہ ہو جائے ۔ لیکن وہ یہ بھی تو کر سکتی تھی کہ دھوتی کو پیٹ کے اوپر ذرا پھیلا لیتی اور پیٹھ پر چوڑائی میں لے جا کر ہاتھوں کو اس طرح ڈھک لیتی ۔ اور وہ یہی کرتی بھی تھی لیکن جب ایک دم ہنسی آ جائے یا جان بوجھ کر مسکرانا پڑے تو دانت لاکھ پان چبا چبا کر پیلے پڑ چکے ہوں، کالے تو نہ ہوئے ہوں گے ۔

اور وہ ہنستی تو یہ کمبخت دانت جو اَب بھی اس کے بلاؤز سے زیادہ سفید تھے اس طرح باہر نکل آتے کہ سامنے والے دو اس کے نیچے کے ہونٹ پر براجمان ہو جاتے۔ لیکن ہنسی کے علاوہ اب اس کے پاس اور ہتھیار ہی کون سا بچا تھا۔ جس کے پاس جو ہتھیار ہوتا ہے وہ اسے استعمال کرتا ہی ہے۔ توپ والا توپ، بندوق والا بندوق اور پستول والا پستول اور خوبصورت مسکراہٹ والا خوبصورت مسکراہٹ ــــ تو وہ بھی اپنا ہتھیار استعمال کرتی۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس ہتھیار کے استعمال سے وہ اب اور کچھ زیادہ ہی بدصورت لگنے لگی تھی۔

"کہہ جو دیا کہ چار آنے کا دودھ نہیں دوں گا۔" نتھے نے اس کی پیالی برتنوں کی لائن سے ہٹا دی تو دوسرے گاہک بھی لطف لینے لگے۔

"شکو تیرا دولہا کب لوٹ کر آئے گا؟" کسی نے مسکرا کر پوچھا۔

گندے مذاق، بھدی گالیاں، چٹکیاں اور اس سے بھی زیادہ سرِ راہ چھیڑ خانی تو شکو برداشت کر لیتی لیکن اپنے دولہا کے بارے میں کوئی مذاق یا جملہ وہ نہ سہہ پاتی۔

"تیری بہریا تو لوٹ آئی ــــ تو دودھ لینے آیا ہے۔ آدھے گھنٹے کے بعد لوٹے گا تو اس کا بار چھپٹ ہو چکا ہوگا۔ ابھی جا کر دیکھ تو کنڈی اندر سے بند ملے گی۔"

اس کے بعد کسی کی ہمت نہ ہوتی۔ وہ کنڈا ٹوٹی پیالی برتنوں کی لائن میں لگا دیتی تو اب اسے کوئی نہ ہٹاتا اور جب اس کا نمبر آتا اور نتھا پچیس پیسے کا دودھ اس کی پیالی میں ڈال دیتا تو وہ بلاؤز کے اندر سے ایک گندا سا رومال نکال لیتی، پھر اس میں لگی ہوئی دو گرہیں کھولتی اور بیس پیسے نکال کر نتھا کی ہتھیلی پر رکھ دیتی۔

"آج اتنے ہی ہیں۔"

"یہ آج کئی مہینوں بلکہ برسوں سے چل رہا تھا۔ معلوم نہیں دودھ والا ہر روز دھوکا کھاتا تھا یا دودھ ہی بیس پیسوں کا دیتا تھا۔

یہ جو سامنے والی گلی ہے اس میں تھوڑی دور چلنے کے بعد دو بار بائیں اور پھر ایک بار دائیں طرف مڑنے کے بعد شکّو کا کمرہ آتا ہے۔ دس فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا، پرانا سا، بے مرمّت کمرہ۔ کوئی پندرہ سال اُدھر وہ کہیں سے آکر یہاں ٹک گئی تھی۔ پانچ چھ سال تو ایسے گذر گئے کہ کسی نوکری دوکری کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ پھر گھروں میں جھاڑو پونچھ اور اوپر کے کام کرنے لگی۔ لیکن جانے کیا بات تھی ہر جگہ دو چار مہینہ بعد چھڑا دی جاتی۔ نام شاید شکیلہ تھا لیکن اب شکّو لوگوں کی زبان پر اس طرح چڑھ گیا تھا کہ کسی کو اس کا اصلی نام بھی یاد نہیں رہ گیا تھا۔

شکّو کے اس کمرے میں آنے کے کچھ دنوں بعد میونسپلٹی والوں کو جانے کیسے گلیوں کا اندھیرا دور کرنے کا خیال آیا تو ایک بریکٹ لگا کر اس کے گھر کے پاس کی دیوار پر ایک بلب لگا دیا گیا۔ جس دن پہلے پہل بلب جلا تو شکّو خوب خوش ہوئی۔ "اب چراغ کاہے کو جلاؤں، آٹھ آنے مہینہ کا تیل پھُنک جائے ہے۔" اس نے کہا۔

لیکن دو تین دن بعد ایک شام اس کے گھر کے پاس روشنی نہ ہوئی تو لوگوں کو اندھیرے کا احساس ہوا۔ اگلے دن دیکھا تو ایسا لگا جیسے کسی نے غلیل سے بلب توڑ دیا تھا۔ بلب کے پیچھے کا پیتل کا کٹورا لگا ہوا تھا اور وہ جو شیشے کی ایک گھنڈی ہوتی ہے اس پر دو تار الگ الگ اب بھی جھول رہے تھے تھوڑے دنوں بعد میونسپلٹی والے دوسرا بلب لگا گئے۔ لیکن تین چار دن بعد بلب پھر اسی طرح ٹوٹ گیا۔ اور اب جو گلی اندھیرے میں ڈوبی تو پانچ چھ سال بعد جب روشنی ہوئی تو کسی کو بلب توڑنے کا خیال بھی نہ آیا۔ لیکن ـــــ یہ ان دنوں کی بات ہے جب شکّو گھر گھر جا کر کام کرنے لگی تھی۔ اسے بھی اب دس بارہ سال ہو چکے ہیں۔

شروع شروع میں جب شکّو گلی سے نکلتی' لاپرواہی کی چال چلتی ہوئی' نہ پاؤڈر، نہ دانتوں کو چھپانے کی کوشش، نہ کپڑوں کا ہوش تو لوگ مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھتے اور اب شکّو کبھی کبھی خوب میک اپ کرتی، خوب بھینچے ہوئے نیلے بلاؤز پر لال ساڑی باندھ کر جو ٹخنوں سے کم سے کم چھ سات انگل اوپر رہتی' کچھ چھپاتی' کچھ دکھاتی' تو نہ کوئی رُکتا نہ اس کی طرف ان نظروں سے

دیکھنا جو اُسے کبھی چھیتی نہ تھیں۔ لیکن اب بھی کوئی مسکرائے بغیر سادگی سے اس سے پوچھتا "شکو تیرا دولہا ابھی لوٹ کر نہیں آیا" تو وہ بڑی جھلاہٹ سے جواب دیتی۔

" بس اب آیا ہی چاہتا ہے۔ اگلے مہینے ضرور آجائے گا۔ "

اپنے جملے کا اثر دیکھنے کے لیے وہ سوال کرنے والے کے چہرہ پر نظر ڈالتی اور وہاں اُسے وہی سادگی ملتی جو سوال کرتے وقت تھی تو وہ بات آگے بڑھاتی۔

" ایسے خالی ہاتھ کیسے آجائے۔ سونے کے کڑول ہیرے کی کیل اور کانوں کے جھالوں کا انتظام کرلے تو آجائے گا۔ خط میں لکھا تھا اس مہینے کے آخر تک سب انتظام ہو جائے گا' بس اگلے مہینے ضرور آؤں گا۔ "

اب سوال پوچھنے والے کے لیے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو جاتی اور وہ ہنس دیتا تو شکو کو ایک دم غصہ آجاتا۔

" گھر میں بار نہیں پاتا ـــــ مجھ سے مذاق کرنے چلا ہے " اور اس کی بہن کی نوبت آجاتی پھر اس کی ماں کی، پھر باپ کی، پھر، پھر ـــــ

لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اگر کوئی دوسرا اسی سادگی سے وہی سوال پوچھ لیتا تو وہ اسی خلوص سے کچھ دیسا ہی جملہ دہرا دیتی۔

" اس مہینے کے اخیر تک سب انتظام ہو جائے گا، کھالی ہاتھ کیسے آجائے گا۔ بس اگلے مہینے ضرور آئے گا۔ "

لیکن اب تو لوگوں نے یہ پوچھنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ شکو تیرا دولہا کب آئے گا۔ اسے لوگوں کی یہ بے رُخی کبھی کبھی بے حد کھلتی۔ کوئی دودھ کا برتن لائن سے ہٹا دیتا تو وہ سچ مچ غصہ ہو کر کہتی۔

" بس اب دو چار دن کی کسر ہے۔ اس کا رکھا ہوا برتن کوئی ہٹائے گا تو ایک ہی تھپڑ میں چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ "

لوگ ہنس پڑتے تو اس کا پارہ اور چڑھ جاتا۔ پہلے کچھ صلواتیں چھیڑنے والوں کے حصہ

میں آئیں، پھر ان کی بیویوں کے حصّہ میں، اس کے بعد ان کی ماؤں، بہنوں کا نمبر آتا۔
اس بیچ کوئی مصلح صفائی کرانے کے لیے کہتا ہے۔
" بس بس بھی کرو شکو اماں۔" تو وہ ایک دم بھڑک اٹھتی ہے۔
" اے ہے انہیں تو دیکھو، مجھے شکو اماں کہتے ہیں۔ ابھی تو بیچارے کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے۔ ایک چانٹا ماردوں تو ساری بتیسی باہر نکل آئے گی۔"
شکو پہ جملے کسنے والوں، اس کا مذاق اڑانے اور اسے چھیڑنے والوں میں وہ بھی ہیں جن کی غلیلوں نے اس کے دروازے کے بلب توڑ دیے تھے۔ لیکن وہ بات شکو زبان پر کبھی نہیں لاتی۔ بُری سے بُری بات کرے گی، گندی سے گندی گالی دے ڈالے گی لیکن وہ بات اس کی زبان پر کبھی نہ آئے گی، اور آئے بھی کیسے اس کا دولھا جو اگلے مہینے آنے والا ہے ۔۔۔ ہیرے کی کیل، سونے کے کڑے اور کانوں کے جھالے لے کر۔
اب جو سورج ڈوبا اور روشنی کے علاوہ رات اور دن میں کوئی فرق نہیں رہ گیا اور اس کے مکان کے پاس کے بریکٹ پر بلب جلا تو اس نے کمرہ کا دروازہ بند کر لیا اور ہیرے کی کیل، سونے کے کڑوں اور کان کے جھالوں کے خواب آنکھوں میں لیے جانے کب اسے نیند آگئی ۔۔ رات کے جانے کتنے بجے تھے کہ کسی نے دروازہ بھڑبھڑایا۔
"کون ہے؟" جب دروازہ شاید تیسری بار بھڑبھڑایا گیا تو اس نے کہا۔
کسی نے دروازہ پھر بھڑبھڑایا۔
"کون ہے رے؟" اب اس نے 'رے' کا بھی اضافہ کر دیا۔
" شکو دروازہ کھول ۔۔۔ میں ہوں نفیرے ۔۔۔ کھول دروازہ نہیں تو پولیس والے پکڑ لے جائیں گے، ساری گلی میں گھوم رہے ہیں۔"
شکو نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا
" تو تو بڑا بہادر بنتا تھا۔" اس نے نفیرے کو کمرہ میں گھسیٹتے ہوئے کہا "اب کہاں نکل گئی ساری بہادری۔"
نفیرے نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا اور سانسیں برابر کرنے لگا۔ پھر دو منٹ بعد بولا۔

"پولیس والے کہتے ہیں کرفیو لگا ہے' گھر کے باہر مت لیٹو ۔۔۔۔ میں نے لاکھ کہا کہ میرا کوئی گھر ہے نہ دوار، لیکن وہ مانتے ہی نہیں ۔"

"تو تو پرسوں گاؤں جانے کو کہہ رہا تھا" شکو نے پوچھا ۔

"یہ پھنس جو پڑ گئی ۔ ایک دن اور گڑبڑ نہ ہوتی تو میں پار ہو گیا ہوتا ۔"

اب نفیرے نے اپنی چھوٹی سی پوٹلی ایک کونے میں رکھ دی اور کرتے کی جیب سے ایک پڑیا نکال کر شکو کے میلے کچیلے تکیہ کے نیچے رکھنے لگا تو اس نے پوچھا ۔

"یہ کیا ہے ۔؟"

" تھوڑے زیور ہیں ۔ میں نے سوچا ڈیڑھ سال بعد گھر لوٹ رہا ہوں تو خالی ہاتھ کیا جاؤں ۔" نفیرے نے کہا ۔

"میں دیکھوں ۔" شکو کی آنکھیں چمکنے لگیں ۔

نفیرے نے شکو کی رال ٹپکتی دیکھی تو پڑیا کھول دی ۔ سونے کی طرح جھلمل جھلمل کرتے پیتل کے دو چھالے، ہیروں کی چمک والی شیشہ لگی کان کی کیل اور چھماچھم کرتے کڑے ۔ شکو انھیں اپنے ہاتھوں میں لے کر دیکھنے لگی ۔ دروازہ کی جھری سے آنے والی بلب کی روشنی میں یہ نقلی زیور اور بھی چمک اٹھے ۔ اس نے اس ہتھیلی پر جس پر زیور رکھے تھے اپنی دوسری ہتھیلی رکھ دی، جیسے ان کی چمک کو باہر کی دنیا سے چھپا کر اپنے دل میں اتار رہی ہو ۔ پھر نفیرے سے بولی ۔

" اسی بسولے پر سو رہ ۔۔۔۔ میں بھی ایک کونے میں پڑی رہوں گی ۔"

اندھیرے سے روشنی کی جنگ بس شروع ہی ہوئی تھی کہ سامنے والی گلی سے ایک سایہ ابھرا ۔ اس سایہ کو دیکھتے ہی سڑک پار سامنے والی دوکان کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے سپاہی ایک دم چیخے ۔

" ہو ۔ ہو ۔"

لیکن اس سایہ پر کوئی اثر نہ ہوا ___ اتنے میں ایک سپاہی جس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی ہوشیار ہو کے بیٹھ گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن دھند لکے میں بس ایک سایہ سے زیادہ اسے کچھ دکھائی نہ دیا تو اس نے چلّا کر کہا۔

"چل بھاگ گلی میں کرفیو ہے۔"

سائے نے اب بھی جیسے کچھ نہ سنا تو سپاہیوں کو پریشانی ہونے لگی۔

"کچھ گڑبڑ ہے۔" ایک سپاہی نے دوسرے سے کہا۔

"بندوق دکھاؤ، بھاگ جائے گی۔" وہ اتنی دور سے دھند لکے میں یہ بھی نہ دیکھ سکے کہ گلی سے نکلنے والا مرد ہے یا عورت۔

ان میں سے ایک سپاہی نے ڈرانے کے لیے بندوق کندھے سے لگالی۔ سامنے والے سائے کو للکارا اور غصہ میں دانت بھینچے تو بندوق کی لبلبی پر رکھی ہوئی انگلی بھی غصہ میں تن گئی اور ایک شعلہ لپکا۔ سامنے ایک سایہ ہوا میں لہرایا، کچھ جھولا اور پھر سڑک پر لڑھک گیا۔

بالوں میں افشاں، کانوں میں جھالے، ہاتھوں میں کڑے، ناک میں کیل۔ خون نے اس کا چہرہ اور آس پاس کی زمین گلنار ہو گئی، لیکن کسی نے یہ بھی نہ پوچھا ___ "یہ کیا تھا؟"

بادل کڑ کا تھا یا فیر ہوا تھا ___ کہ اس کا دولھا زیور لے کر آ گیا تھا۔

▬▬

III

یہ واقعہ ہے، یا کوئی منظر ہے، خواب کا

آنکھ کھلتے ہی وہ اپنی عادت کے مطابق لحاف جسم پر سے ہٹا کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُسے جانے کیسے بہت پہلے کہیں پڑھا ہوا ایک جملہ یاد آ گیا۔ لیکن یہ یاد کچھ دُھندلی دُھندلی سی تھی۔ کچھ ظاہر اور زیادہ ترچھپی ہوئی۔ جیسے گھرے بادلوں کے پیچھے سورج۔ اسے جملے کے مفہوم کا کچھ کچھ احساس تو تھا۔ لیکن پوری بات یاد نہیں آ رہی تھی۔ اس نے ذہن پر زور ڈالا تو جیسے سورج نے بادلوں سے نکلنا شروع کیا۔ اب اس جملے کے الفاظ بھی دھیرے دھیرے یادداشت میں ابھرنے لگے۔

وہ جملہ کچھ یوں تھا "آنکھ کھلتے ہی بستر سے اس طرح نہ بھاگو جیسے کسی نے تمھیں ڈنک مار دیا ہو، بلکہ اس خواب کے بارے میں سوچو، جو تم نے دیکھا ہے۔"

"خواب! خواب تو اس نے بہت دنوں سے نہیں دیکھا، شاید کئی برسوں سے۔" اس نے سوچا۔

یہ خیال اس قدر پختہ تھا کہ اس نے دماغ پر زور ڈالنے کی کوشش بھی نہیں کی اور یہی سوچتا رہا کہ نیند ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ایک بہت پُرانا خواب اُسے یاد آ رہا تھا۔ کسی ایسی کھوئی ہوئی چیز کی طرح جسے بھولے ہوئے بھی ایک عرصہ ہو گیا ہو اور جو ایک دم یاد آ گئی ہو۔

ایک بہت بڑا مکان تھا۔ بہت سے کمرے اور دالان تھے، باہر بڑا میدان سا تھا جس کے ایک حصّہ میں چھوٹا سا باغ تھا۔ اُسی لمحہ وہ اُلجھن میں پڑ گیا کہ وہ خواب یاد کر رہا ہے یا حقیقتوں کو خواب کی شکل دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن نہیں، یہ خواب ہی تھا۔ حقیقتوں سے زیادہ خوبصورت۔

باہر بڑا سا میدان ضرور تھا، باغیچہ بھی تھا، لیکن خواب کے باغیچہ سے کچھ چھوٹا، کمرے اور دالان بڑے ضرور تھے لیکن ایسے سجے ہوئے نہ تھے جیسے خواب میں اس نے دیکھے تھے۔ ان کمروں اور دالانوں میں صاف ستھری وردیاں پہنے اِدھر اُدھر آتے جاتے ملازم بھی نہ تھے۔ عیش و آرام کا ایسا سامان بھی نہ تھا جیسا خواب کے ان کمروں میں تھا۔

پھر اسے یاد آیا کہ تیس سال قبل کے اس خواب کو اس نے برسوں یاد رکھنے کی کوشش کی تھی۔ پوری تفصیل کے ساتھ کہ ایسا ہی مکان ہوگا، ایسا ہی باغیچہ، کتابوں کی ایسی ہی خوبصورت الماری۔ لیکن پھر آندھیاں اتنی تیز چلنے لگی تھیں کہ سب کچھ بکھر کر رہ گیا تھا اور فراغت فرصت کا کوئی ایسا لمحہ بھی ہاتھ نہ آیا تھا جس میں بیٹھ کر وہ اُسے یاد ہی کر لیتا۔

ابھی وہ اس خواب کے کمروں اور دالانوں میں گھوم پھر کر ایک ایک چیز کو حیرت اور استعجاب سے دیکھ ہی رہا تھا کہ اُسے ایک دوسرا خواب یاد آ گیا اور جیسے اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

چار کمروں کا ایک بے حد خوبصورت سا مکان، اس نے ابھی ایک ہی کمرہ دیکھا ہے۔ لیکن جانے کیسے اُسے احساس ہے کہ مکان میں چار کمرے ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک۔ مکان میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اسے یہ بھی یاد نہیں کہ وہ اس مکان میں کب اور کیسے آیا ہے۔ کب اور کیسے؟ شاید چاروں طرف آگ لگی تھی جس کی لپٹیں اس کے جسم کو چھونے ہی والی تھیں، بلکہ چھونے لگی تھیں۔ کل نہیں، پرسوں۔ لیکن یہ بات اتنے قریب کی نہیں پھر بھی اس نے اس مکان میں اس نے داخل ہو کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔

سجی سجائی الماریاں دیوار سے لگی کھڑی ہیں۔ کسی میں پھول ہی پھول ہیں۔ جو ہیں تو شاید پلاسٹک کے، لیکن ان کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک رہا ہے۔ ایک دوسری الماری میں چینی کے زنگار رنگ برتن سجے ہوئے ہیں۔ اتنے خوبصورت برتن اُس نے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ تیسری الماری سِلے سلائے کپڑوں سے بھری ہے، کچھ کپڑے ہینگروں میں ٹنگے ہیں اور کچھ نہایت سلیقے سے تہہ کیے ہوئے رکھے ہیں۔ الماری بند ہے، لیکن اس میں تالا نہیں لگا ہے۔ اس نے کسی کپڑے کو چھُوا تک نہیں ہے لیکن اسے احساس ہے کہ یہ سارے کپڑے جیسے اسی کے لیے سیے گئے ہیں۔ دیوار پر ایک نہایت خوبصورت روغنی تصویر ٹنگی ہے۔ وہ تصویر کی طرف بڑھتا ہے، ذرا قریب سے دیکھنے کے لیے۔ یہ تصویر یقیناً کسی مغربی فنکار کا شاہکار ہے۔ ایک حسینہ جس کے بال کھُلے ہوئے ہیں، ہاتھ آسمان کی جانب بلند کیے ہوئے، بیخودی کے عالم میں دُور ابھرے ہوئے چاند کو دیکھ رہی ہے۔ اس کے چہرے پر معصومیت، حسن، شرم اور پاکبازی کا ایسا امتزاج ہے جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ مغرب کے آئینہ میں مشرق کا عکس۔ سب کچھ بھول کر وہ بھی اپنے ہاتھ اسی طرف بڑھاتا ہے تو اس کا ایک ہاتھ بائیں جانب کے دروازہ پر جھولتے ہوئے پردے سے ٹکراتا ہے۔ پردہ کی دبازت کا اُسے ایک دم احساس ہوتا ہے۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کے اس پردہ پر جس پر بڑے بڑے پھول بنے ہوئے ہیں، آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا ہے۔ اتنا نرم اور خوبصورت کپڑا تو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ پردہ اٹھاتا ہے تو دوسرا کمرہ نظر آتا ہے۔ وہ نہایت آہستگی سے اس میں داخل ہوجاتا ہے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک ایک چیز کو دیکھتا ہے۔ یہ کمرہ پہلے والے کمرے سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔

سامنے دیوار پر ایک نقشین گھڑی ٹنگی ہے، بیل بوٹوں سے ایسی سجی ہوئی ہے جیسے گھڑی نہیں گلدستہ ہو۔ لیکن اس کا ڈائل بالکل صاف ہے۔ نہ کوئی سوئی ہے، نہ گھنٹوں، منٹوں کی سوئیاں اور نشان۔ بس پینڈولم ایک جانب سے دوسری جانب یکساں

رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ اسے پہلی بار وقت کے عدم وجود کا احساس ہوا۔ دن ہے کہ رات۔ اس نے سوچا لیکن کسی نتیجہ تک نہ پہنچ سکا۔ کیا یہاں وقت رُک گیا ہے۔ لیکن اگر وقت رُک گیا ہے تو پنڈولم حرکت کیوں کر رہا ہے؟ وہ سوچنے لگا، سوچتا رہا۔ اور پنڈولم کی کسی حرکت نے اس کے دماغ کو آنکھوں میں تبدیل کر دیا اُسے احساس بھی نہیں ہوا۔

کمرے کی ایک ایک چیز ایسی تھی اور اس قدر قرینے سے رکھی تھی کہ کسی کمی کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ بائیں طرف ایک میز پر طرح طرح کے پھل رکھے ہوئے تھے۔ تر و تازہ ایسے کہ جیسے شاخوں سے توڑے ہی نہ گئے ہوں۔ اسے بھوک کا کچھ کچھ احساس ہونے لگا تھا۔ لیکن بس ایسا جیسا کہ کسی بہت لذیذ چیز کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ اس نے کرسی کھینچی۔ ایک سیب اٹھایا اور چھری سے کاٹا تو اس میں سے رس پھوٹ پڑا۔ سیب اس قدر لذیذ اور میٹھا ہو سکتا ہے۔ یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ پھر اس نے انگور کے چند دانے مونہہ میں ڈال لیے جو فوراً ہی گھل کر ایک عجیب سے سرور سے اُسے روشناس کرا گئے۔ کیا جنت میں ایسے ہی پھل ہوں گے۔ اس نے سوچا۔ ہاں ایسے ہی ہوں گے۔ اس نے خود جواب دیا۔ کیونکہ اس سے بہتر پھلوں کا تصوّر بھی ممکن نہیں۔

اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ سامنے والا دروازہ ہی دوسرے کمرے میں کھلتا تھا وہ پردہ اٹھا کر اس میں داخل ہو گیا۔ یہ کمرہ ان دو کمروں سے بھی خوبصورت تھا۔ سامنے مسہری پر بستر بچھا تھا۔ جسے دیکھتے ہی اس کی نرمی کا احساس ہونے لگا۔ وہ خود پر قابو نہ پا سکا اور جوتے پہنے پہنے ہی بستر پر دراز ہو گیا اور اس کا سارا جسم نرم گدّے میں دھنستا چلا گیا۔ اس بستر پر تو کوئی آنکھ کھولے کھولے بھی لیٹے تو پانچ منٹ ہی میں نیند کی دنیا میں چلا جائے۔ اس نے آنکھیں بند کیے کیے سوچا۔

پھر اس نے اپنے خیال کی سچائی کو پرکھنے کے لیے آنکھیں کھولیں تو ایک ہی جست

میں بستر سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور چھت کو گھورنے لگا جہاں ایک ننگی تلوار بال سے باریک تاگے سے لٹک رہی تھی ؛ تاگا ٹوٹ جاتا تو تلوار سیدھی اس کے سینے میں پیوست ہو جاتی ۔ اس نے سوچا اور تیزی سے سامنے والے دروازہ کی طرف بڑھ گیا جو چوتھے کمرہ میں کھلتا تھا ۔

یہ کمرہ ذرا تکونا سا تھا جس کے اس عیب کو چھپانے کے لیے ایک کونے میں لکڑی کی ایک جالی کھڑی کر دی گئی تھی ۔ اور دوسرے میں پھولوں سے لدے ہوئے پودوں کے کچھ گملے سجا دیے گئے تھے ۔ اس دروازہ سے جس کا رُخ باہر کی طرف تھا، روشنی کی ایک کرن آ رہی تھی ۔ لیکن وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ کرن سورج کی تھی یا چاند کی ۔ اس نے دراز میں سے باہر جھانکا تو ایک لق و دق میدان سامنے تھا، چٹیل، بے برگ و گیاہ میدان ، لیکن اب بھی اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ اس وقت دن تھا یا رات ۔ دروازہ اندر سے بند تھا ۔ اس نے زنجیر کھولی اور دروازہ کو اپنی طرف کھینچا لیکن اس میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی ۔ اس نے زور سے دھکا دیا لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا ۔ اب اُسے خوف کا ہلکا ہلکا احساس ہونے لگا تھا ۔ وہ تیزی سے تیسرے کمرے میں گیا، تیسرے سے دوسرے میں اور دوسرے سے پہلے میں، اس خیال سے کہ پہلے والے کمرہ میں باہر جانے کا راستہ ضرور ہو گا ۔ لیکن اس میں تو بس ایک ہی دروازہ تھا جس سے وہ ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا ۔ وہ تیزی سے پلٹا ۔ لیکن کسی کمرے میں ایک ایک دروازہ کے علاوہ کوئی اور دروازہ نہ تھا ۔ چوتھے کمرہ میں اس جگہ جہاں سے اس نے ابھی ابھی دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی کوشش کی تھی، پھٹے پرانے کپڑے کا ایک پردہ لٹک رہا تھا ۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر پردہ اٹھایا تو وہاں دروازہ کا نشان تک نہ تھا ۔ وہ تیسرے کمرے کی طرف پلٹا ۔ اسی لمحہ اُسے اس خوبصورت ، نرم ، دبیز گدے کا خیال آیا جو مسہری پر بچھا تھا ۔ " کس قدر آرام دہ تھا وہ بستر " اس نے سوچا ۔

مسہری اپنی جگہ موجود تھی ۔

" لیکن اس آرام دہ بستر سے فائدہ جس پر تلوار لٹک رہی ہو۔"

بستر اپنی جگہ سے غائب تھا۔

" پھل کس قدر لذیذ تھے۔"

میز پر انواع و اقسام کے پھل سج گئے۔

" لیکن صرف پھل کب تک ؟"

گرم ہوا کا ایک تھپیڑا اس کے جسم کو جھلستا ہوا گذر گیا۔

" الماری میں کس قدر خوبصورت کپڑے رکھے تھے۔ ان کو پہن کر میں کتنا اسمارٹ لگوں گا۔"

طرح طرح کی خوشبوؤں سے اس کا دماغ مہک اٹھا۔

" لیکن مجھے ان خوبصورت کپڑوں میں دیکھے گا کون ؟" انھیں پہن کر باہر نکل سکوں تو ۔۔۔!"

روغنی تصویر کے ہاتھوں کے پنجرنے اپنے گرفت میں لینے کی کوشش کی۔

اب جو وہ پلٹا تو اس نے دیکھا کہ وہ تلوار جو تھوڑی دیر قبل چھت سے لٹک رہی تھی، ہوا میں لہرا رہی تھی اور دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے اور دوسرے کمرے سے تیسرے کمرے کی طرف بھاگا۔ پلٹ پلٹ کر اس تلوار کو دیکھتے ہوئے جو اس کے پیچھے پیچھے چلی آرہی تھی۔ وہ چکرا کر فرش پر گر گیا۔ تلوار اس کے سینے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

" اب بھاگنے سے بھی کیا ہوگا ؟" کسی نے کہا۔

" لیکن یہاں تو کوئی ہے نہیں ۔۔۔" اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوچا۔

کوئی تھا بھی نہیں۔

" آگے بڑھ کر تلوار پکڑ لے اور اسے گھٹنے پر مار کر توڑ دے۔" ایک دوسری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"تلوار کو ہاتھ لگائے گا تو ہاتھ زخمی ہو جائے گا۔"

دعا مانگ ——" رب العزت اس مصیبت سے نجات دلا۔"

وہ تلوار کو بھول کر جو اس کے سینے پر تنی ہوئی تھی، چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہ آوازیں کہاں سے آ رہی تھیں۔ متضاد آوازیں۔ امید اور حوصلہ دینے والی اور مایوس کر دینے والی آوازیں۔ لیکن کچھ بھی ہو، یہ آوازیں اس کے دل و دماغ سے گزرنے والی ہر لہر سے واقف تھیں۔

" صبر کر کہ خدا صابروں کے ساتھ ہے۔" کسی نے سرگوشی کی۔

" صبر کر لے ——" یعنی تلوار کے سامنے اپنا سینہ کھول کر کھڑا ہو جائے اور کہے۔ "اے ظلم کی تلوار آگے بڑھ اور میری روح کو میرے جسم سے جدا کر دے۔"

ایک دوسری آواز گونجی ——" موت اور زندگی تو خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن تدبیر کر، عمل کر۔"

یہ خیال اس کے دل کے پاس سے اس قدر آہستگی سے گذرا کہ وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ خود اس کا اپنا خیال تھا یا کسی دوسرے کی آواز۔

تلوار اب بھی اس کے سامنے فضا میں معلق تھی لیکن اب اس میں وار کرنے کی شاید ہمت نہیں رہ گئی تھی یا شاید اس کی دھار کند ہو گئی تھی۔ اُس نے ایک قدم آگے بڑھایا تو ایسا لگا جیسے تلوار پیچھے کی جانب رُخ کر رہی ہو۔

" اتنے صحرا، اتنے دریا، اتنے پہاڑ، اتنے سمندر کہاں سے ان چار کمروں میں سما گئے۔" اس نے تلوار کا تعاقب کرتے کرتے سوچا۔ لیکن اب ان کمروں کی دیواریں بھی نظر نہ آ رہی تھیں اور اس کے لیے ان کے درمیان کے فاصلوں کا اندازہ کرنا مشکل ہو گیا تھا اور وہ سمندروں صحراؤں اور پہاڑوں پر دوڑتا ہوا تلوار کو اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کر رہا تھا اور فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ آخر اس نے تلوار کو جا ہی لیا۔

گھر کے سارے لوگ اس کے بستر کے چاروں طرف کھڑے تھے اور ان میں سے ہر ایک

دوسرے کو حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اتنا زوردار قہقہہ تو آپ کبھی نہ لگاتے تھے۔ میں تو ڈر گئی تھی۔" اس کی بیوی نے کہا۔

اس نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔ خوبصورت کمرے، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر، دھاردار چٹانوں کے بڑے بڑے پہاڑ، اندھیروں کو اپنے دامن میں سمیٹے صحرا۔

وہ خود بھی حیران نظروں سے ان کو دیکھتا رہا۔ پھر جیسے اسے سب کچھ یاد آگیا۔

"ایک پیالی چائے تو پلادو۔" اس نے کہا۔ اور لوگوں کو ایک ایک کر کے کمرے سے باہر جاتے ہوئے دیکھ کر اس نے سمندروں، پہاڑوں، صحراؤں اور تلوار پر قابو پانے والے لمحہ کی یادوں کے ساتھ کچھ اور وقت گذارنے کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

■■

ایک محبّت کی کہانی

باغ کے درختوں کو جب میں نے پہلی بار دیکھا اس وقت میں کتنے دِنوں کا تھا یہ تو یاد نہیں لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ میں وہاں پہلے سے تھا۔ پاس والے درخت کو اوپر تک دیکھنے کے لیے میں نے آنکھیں اوپر کی ہی تھیں کہ میرا ایک بھائی کھد سے مجھ سے ٹکرا گیا اور میں گر پڑا۔ پھر میرے باقی بہن بھائی بھی آ گئے اور مجھے ایسا لگا کہ کالے کالے گولے ایک دوسرے میں گتھے جا رہے ہوں۔ شاید انہیں بھی ایسا ہی لگ رہا ہو۔ اتنے میں میری ماں آ گئی اور اس نے ہم کو ایک ایک کر کے الگ کیا' منھ سے اٹھا اٹھا کر اور پھر پاس ہی ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گئی۔ ہم سب لڑھکتے لڑھکاتے اس کے پیٹ کی طرف بڑھے، ایک دوسرے سے ٹکراتے' دھکّا دیتے۔ جانے کیسے چپر چپر کی آواز کانوں میں پڑتے ہی میرا منھ میٹھے میٹھے دودھ سے بھر گیا۔ معلوم نہیں یہ آواز میرے منھ سے آ رہی تھی یا میرے کسی بھائی یا بہن کی آواز تھی۔ ابھی میں نے دو چار ہی منھ مارے تھے کہ میری بہن نے دھکّا دیا اور میری جگہ پر قابض ہو گئی۔ پھر نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

اس وقت تو میں ٹھیک سے چل بھی نہ پاتا تھا۔ بس لڑھکتا تھا، زمین کو چھوتا ہوا۔ یہی حال میرے دوسرے بھائی بہنوں کا بھی تھا۔ لیکن اب کچھ باتیں میری سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ مثلاً یہی کہ صبح اور شام کے وقت میری ماں کو بڑی سی رکابی میں کھانا ملتا تھا۔ ہم

سب کبھی ماں کے پیر سے لپٹ جاتے اور کبھی اس کی پلیٹ تک پہنچ جاتے۔ لیکن پلیٹ میں منہ ڈال کے ہم کو کھانا نہ آتا تھا اور جو کھانا وہ بڑے شوق سے کھاتی تھی مجھے اس کی بو ذرا پسند نہ تھی۔ میں دھیرے دھیرے الٹے پاؤں واپس آتا۔ کبھی ماں کے پاس پہنچنے کی کوشش میں میرے پیر پلیٹ میں چلے جاتے تو ماں مجھے منہ میں داب کر ہٹا دیتی۔ پکڑتی تو دانت سے تھی، ہلکی سی چبھن بھی ہوتی لیکن بڑا اچھا لگتا تھا۔ ایک بار تو میں بس اسی مزے کے لیے جان بوجھ کر پلیٹ میں اگلے دونوں پیر رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ماں نے وہی کیا جو میں چاہتا تھا۔ مجھے بہت اچھا لگا تھا لیکن اس کے منہ کا کھانا میری پیٹھ اور پیٹ پر لگ گیا تھا جس سے بری سی بو آ رہی تھی۔

ان دونوں ہم لوگوں کے بس دو ہی کام تھے۔ دودھ پینا اور سو جانا یا پھر بھائی بہنوں کے ساتھ کھیلنا۔ اور کھیلنا بھی کیا تھا بس ایک دوسرے کو دھکے دیتے یا گرانے کی کوشش کرتے اور ذرا سی دیر میں بھوکے ہو جاتے، جسر جسر دودھ پیتے اور سو رہتے۔

کبھی کبھی جانے کیسے چاروں طرف کی روشنی کم ہونے لگتی اور جب ہم دودھ پیتے پیتے سو جاتے تو ہماری ماں ایک ایک کر کے ہمیں اپنے منہ سے ہٹا کر ایک چھپّر کے اندر پیال پر لٹا دیتی۔ نیند میں بھی مجھے اس کے دانتوں کی معمولی سی چبھن اور منہ کے گوشت کی نرمی بہت اچھی لگتی۔ جب آنکھ کھلتی تو ملگجی ملگجی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوتی جو دھیرے دھیرے بڑھتی جاتی۔ اس کے بعد پھر وہی چکر چلتا۔ دودھ پینا، تھوڑی بہت اچھل کود کرنا، پھر دودھ پینا اور سو جانا۔

کیسے مزے کے دن تھے وہ بھی۔

ایک دن ہم لوگ اسی طرح کھیل رہے تھے اور ماں تھوڑی دور لیٹی ہمیں بس دیکھے جا رہی تھی کہ ایک دم کھڑی ہو گئی اور زور سے بھونکنے لگی۔ میں تو ڈر ہی گیا اور میرے سارے بھائی بہن اپنی لڑھکنیاں بھول کر ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے۔ میں تو تھر تھر کانپ رہا

تھا۔ شاید میرے بھائی بہن بھی کانپ رہے تھے کیونکہ کبھی ہمارے بدن ایک دوسرے سے ٹکراتے اور کبھی الگ ہو جاتے۔ ماں اتنے زور سے بھونک سکتی ہے یہ مجھے معلوم ہی نہ تھا۔ میں نے دھیرے دھیرے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک کالی کالی سی چیز اوپر اڑ رہی تھی۔ ماں منھ اوپر کیے اس وقت تک غرّاتی رہی جب تک وہ اڑتا ہوا دھبّا بھاگ نہ گیا۔ اس کے بعد وہ ہمارے پاس آکر لیٹ گئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ سر اٹھا کر اوپر کی طرف ضرور دیکھ لیتی تھی۔ میرے بھائی بہن تو اس کے پیٹ سے چپکے ہوئے تھے اور میں ڈر کے مارے اس کی پچھلی ٹانگوں کے بیچ گھس گیا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ مجھے اس کی رانوں کے گوشت کی گرمی بہت اچھی لگی تھی۔

اس طرح کھیلتے، دودھ پیتے اور سوتے کئی بار اندھیرا چھایا اور کئی بار روشنی پھیلی۔

ایک دن دو لڑکے میرے مکان کے باہر آکر کھڑے ہو گئے اور کچھ دیر تک بات چیت کرتے رہے۔ ان میں سے ایک کو تو میں کچھ کچھ جانتا تھا۔ کبھی کبھی وہ میری ماں کے پاس بیٹھ کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا کرتا تھا۔ ایک آدھ بار کھانا لے کر وہ بھی آیا تھا لیکن یہ دوسرا لڑکا میرے لیے بالکل نیا تھا۔ جب پہلے والے نے مجھے اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دیا تو میری ماں غرّائی لیکن بس دھیرے دھیرے۔ تھوڑی دیر بعد دونوں آم کے درختوں کے بیچ سے چلتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ وہ لڑکا جو تھوڑی دیر پہلے آیا تھا مجھے ایک ہاتھ میں اپنے سینے کے پاس پکڑے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ سے برابر میرا سر سہلا رہا تھا مجھے اپنے بھائی بہن اور ماں کی یاد تو آ رہی تھی لیکن اس کے ہاتھوں کی گرمی بھی اچھی لگ رہی تھی۔

دونوں تھوڑی دیر تک کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہے پھر اس نے جسے میں پہلے سے کچھ کچھ جانتا تھا اس سے جو میرے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا کچھ کہا اور چلا گیا۔ ذرا سی دیر بعد وہ لوٹ آیا ـــــ اس کے ہاتھ میں سفید سفید سی کوئی گول گول چیز تھی، میں اسے

ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا تھا۔ اس لیے میں نے اس لڑکے کے چہرے پر سے نظریں ہٹا کر جسے میں بہت دیر سے ٹکرٹکر دیکھ رہا تھا اس گولے کو دیکھنے کی کوشش کی ۔لیکن مجھے وہ چیز نظر نہیں آئی ۔ تھوڑی دیر تک دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے ۔ اس کے بعد انہوں نے ایک دوسرے سے اتنے زور زور سے ہاتھ ملایا کہ میرا پورا بدن ڈر کے مارے کانپنے لگا ۔

۲

وہ نوجوان مجھے گود میں لیے بیٹھا تھا۔ اِدھر اُدھر، آگے پیچھے بھی کئی لوگ بیٹھے تھے ۔ مجھے ہوا خوب لگ رہی تھی ۔ بھر بھر کی عجیب عجیب سی آوازیں آرہی تھیں ۔ کبھی کبھی زوردار آواز ہوتی اور میں آپ ہی آپ گود میں اچھل پڑتا ۔ مجھے کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں میں نے دھیرے دھیرے گردن گھمائی اور اس کی طرف دیکھا ۔ وہ مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سچ بتاؤں تو مجھے بھوک لگ رہی تھی شاید اسی لیے میں "کوں کوں" کر رہا تھا۔

" بھوک لگی ہے " اس نے میرے پیٹ میں دھیرے دھیرے گدگدی کی اور جانے کہاں سے کاغذ میں لپٹا ہوا گولا نکال لیا ۔ یہ تو وہی چیز تھی جس کی اس وقت میں نے ایک جھلک دیکھی تھی۔ تھوڑی دیر تک جانے وہ کیا کیا کرتا رہا ۔ اس کے بعد جانے کیسے ایک موٹی سی ملائم اور گیلی تتی میرے منھ کے اندر پہونچ گئی اور دودھ ایسی کسی چیز سے میرا منھ بھر گیا ۔ لیکن مجھے کچھ خاص مزا نہ آیا ــــ نہ اس میں ماں کے پیٹ کی گرمی تھی نہ وہ مٹھاس ۔ مجھے ابکائی سی آئی لیکن کیا کرتا پیٹ خالی تھا اس لیے وہ گیلی تتّی منھ سے نہیں نکالی ۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ لڑکا تتّی میرے منھ سے نکال لیتا اور جانے کیسے اس میں دودھ بھر کے پھر میرے منھ میں ڈال دیتا ۔ دو تین بار تو میں کچھ نہ بولا لیکن پھر میں نے خوب کس کر منھ بند کر لیا ۔ اصل میں میرا پیٹ بھر گیا تھا۔

یہ نیا مکان مجھے بالکل اچھا نہ لگا تھا، نہ اتنا بڑا میدان تھا۔ نہ اونچے اونچے درخت نہ سر پر اتنا بڑا آسمان، بھائی بہن تھے نہ ماں۔ کبھی کبھی مجھے ان کی یاد بھی آتی اور میں ادھر اُدھر ان کو ڈھونڈنے لگتا۔ لیکن ایک بات ایسی بھی تھی جو وہاں نہیں تھی۔ گھر کے تین چار لوگوں میں سے ایک نہ ایک ہر وقت میرے آس پاس رہتا۔ یہ لوگ مجھ سے کھیلتے، میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے یا مجھے گود میں لے کر "کانگ کانگ" کہتے۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ سارے ہی لوگ میرے پاس ہوتے۔ ان میں سے کبھی ایک مجھے گود میں لے لیتا اور کبھی دوسرا۔ میں بھی ناز نخرے دکھاتا۔ ایک بلاتا تو میں دوسرے کی طرف چلا جاتا پھر یہ سوچ کر کہ اس کا دل نہ ٹوٹ جائے اس کی طرف لوٹ جاتا۔

اب مجھے ایک چھوٹے سے برتن میں دودھ پلایا جاتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی سخت اور سوندھی سی چیز بھی اس میں ڈال دی جاتی تھی لیکن میں جیسے ہی منھ مارتا وہ بکھر کر دودھ میں مل جاتی۔ اب مجھے یہ دودھ بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ لیکن ایک بات مجھے بہت بری لگتی۔ میں دودھ پیتا تو کوئی نہ کوئی میرے پاس بیٹھا رہتا۔ جب اپنا کھانا کھانے بیٹھتے تو مجھے ایک چھوٹی سی میز پر بٹھا دیتے۔ میں اس کے کونے تک جاتا۔ کبھی ادھر کبھی ادھر، اور زمین بہت دور دیکھ کر ایک دم پیچھے ہٹ جاتا اس پر سب خوب ہنستے اور مجھ سے کہتے۔

"اب ہم کو کھانا کھانے دو، ہم نے تو تمہارے دودھ میں حصہ نہیں بٹایا تھا۔"

ان کی یہ بات مجھے بڑی بری لگتی۔ کوئی میں ان کا کھانا چھینے لے رہا تھا۔ لیکن بعد میں جب وہ پیار سے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے تو مجھے اپنا غصہ یاد بھی نہ رہتا۔ پھر وہ مجھے نرم گدّے پر لٹا کر سہلاتے رہتے جو مجھے بہت اچھا لگتا اور میں سو جاتا۔

اب مجھے نہ ماں کی یاد آتی تھی، نہ بھائی بہنوں کی۔ بلکہ سچ پوچھیے تو میں انھیں بالکل بھول چکا تھا۔ میں اپنا نام بھی پہچاننے لگا تھا۔ جب بھی کوئی مجھے "کانگ" کہہ کر پکارتا

میں دھیرے دھیرے اس کے پیچھے دوڑتا، لیکن ہر ایک کے پیچھے نہیں۔ کوئی نیا چہرہ چاہے کتنے ہی پیار سے میرا نام لیتا میں اس وقت تک بھونکتا اور غراتا رہتا جب تک گھر کا کوئی آدمی نہ آجاتا۔ مجھے ان کی آواز وں کا فرق بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ ایک آواز تیز تھی اور بھاری، ایک باریک اور نرم، ایک باریک اور تیز ـــ یہ تینوں آوازیں تو میں بہت جلدی پہچاننے لگا تھا لیکن چوتھی آواز پہچاننے میں بہت دیر لگی تھی۔ ایک تو وہ بات ہی بہت کم کرتا تھا اور دوسرے وہ گھر میں زیادہ دیر رہتا بھی نہیں تھا۔ صبح کے وقت اس کی صورت دیکھنے کو ملتی یا پھر رات میں۔ وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے۔ ایک کمرے میں جانے کیا کیا کرتا۔

باریک اور نرم آواز والی ایک لڑکی تھی۔ صبح صبح جانے کہاں چلی جاتی۔ ایک چھوٹا سا تھیلا کبھی ہاتھ میں لٹکائے اور کبھی کندھے سے، اور جب سورج ریل کی پٹری کی طرف ذرا سا جھکنے لگتا تو وہ لوٹ آتی۔ اس کی ایک بات مجھے بہت اچھی لگتی۔ کتنی ہی جلدی میں ہو، جاتے وقت میرے سر پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرنا نہ بھولتی۔ ایک عورت بھی جو سارے دن گھر میں رہتی، مجھے چاہتی تو تھی، کھانا بھی وہی دیتی تھی لیکن ذرا دور سے، مجھے چھوتی تک نہ تھی بلکہ کبھی میں اس کی طرف اپنی طاقت بھر تیز دوڑتا تو وہ پیچھے کھسک جاتی۔ اس کی بس یہی بات مجھے پسند نہ تھی۔ وہ لڑکا جو مجھے لایا تھا، مجھے سب سے زیادہ چاہتا تھا لیکن ڈانٹتا بھی تھا۔ میں بھی اسے سب سے زیادہ چاہتا تھا لیکن اس سے کچھ کچھ ڈر بھی لگتا تھا۔ ایک دن اس نے پتھر کے ایسا ایک چھوٹا سا ڈلا اپنے کوٹ کی جیب سے نکال کر میرے سامنے پلیٹ میں رکھ دیا۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا اور میں گیند سے کھیلتا رہا۔ پھر اس نے مجھے گردن سے پکڑا اور میرا منھ پلیٹ کے پاس کر دیا۔ میری ناک ایک عجیب سی خوشبو سے بھر گئی۔ اور میں نے اس پر منھ مارا۔ بہت سخت سی چیز تھی لیکن میرے تیز دانتوں نے دو چار بار

کی کوشش میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے ۔ بڑی مزیدار چیز تھی ۔ میں نے اپنے دانتوں کا پورا زور لگایا پھر بھی اسے توڑنے اور کھانے میں کافی وقت لگا۔ اتنے مزے کی چیز میں نے کبھی نہیں کھائی تھی ۔اس وقت تک مجھے قیمہ کھانے کو نہیں ملا تھا ۔

وہ دن خوب اچھی طرح یاد ہے جب میرے مالک نے مجھے گھر کے باہر اپنے پیروں سے چلایا تھا۔ ویسے آس پاس کے مکان، پارک، ریل کی پٹری، اس سے پہلے کا نالا اور دو چار دوسرے لوگوں کی صورتیں تو میں پہچاننے لگا تھا کیونکہ میرا مالک شام کے وقت اپنی گود میں لے کر اکثر سیر کراتا ۔ لیکن آج اسے جانے کیا سوجھی کہ چار پانچ مکان چھوڑ کر نراہے کے پاس مجھے بیچ سڑک پر چھوڑ دیا۔ میری گردن میں نرم نرم موٹے سے کپڑے کا چمکدار پٹا پڑا تھا۔ میرے مالک نے مجھے گود سے اتار کر سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا کر دیا تو مجھے داہنی طرف کے سارے مکانوں کو غور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ بائیں طرف تو پارک تھا۔ ان سارے مکانوں میں میرا مکان سب سے چھوٹا تھا۔ ایک مکان تو اتنا اونچا تھا کہ میں نظریں اٹھا کر بھی پوری طرح نہ دیکھ سکا۔ اسے دیکھ کر مجھے ذرا سی لالچ آئی ۔ وہاں روشنی بھی خوب ہو رہی تھی ۔ لیکن جب نراہے پر مجھے چھوڑ دیا گیا تو میں نے دوڑ کر اپنے گھر کے دروازہ پر ہی دم لیا ۔ اس وقت میں خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا ۔ دروازے پر میرے مالک کی ماں، اس کی بہن اور وہ آدمی کھڑا تھا جس کی آواز کم کم ہی سننے کو ملتی تھی۔ سب لوگ زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے لیکن اس آدمی نے بس دو تین بار ہی تالی بجائی۔ اس کی یہ بات مجھے اچھی نہ لگی ۔ اور میں دوسری طرف منھ کر کے اچکنے پھاندنے لگا ۔ اتنے میں سڑک پر کوئی تیز سی چیز گذری تو اس لڑکی نے جس نے بہت دیر تک تالی بجائی تھی جلدی سے مجھے زمین سے اٹھا کر گود میں لے لیا ۔

۳

بہت دنوں بعد معلوم نہیں کیسے مجھے یکایک احساس ہوا کہ میں گھر کے چاروں لوگوں

کی آواز کے علاوہ ان کے چلنے پھرنے سے پیدا ہونے والی کھٹ کھٹ بھی پہچاننے لگا ہوں۔ اس پہچان کا سلسلہ شاید میرے مالک سے شروع ہوا۔ ایسے تو وہ تیز آواز میں نہیں بولتا تھا لیکن ایک دن جب میں نے اس کی چپّل کا تسمہ دانتوں سے کاٹ پیٹ کر چھترا بنا دیا تھا تو وہ بہت غصّہ ہوا تھا اور اس نے اتنی گرجدار آواز میں مجھے ڈانٹا تھا کہ میرا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ میں گردن جھکائے اس کے سامنے خاموش کھڑا رہا تھا۔ پھر تھوڑی دیر میں اس کا غصّہ کم ہو گیا اور وہ برآمدے کے کونے میں بیٹھ کر میری گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔

"گڈ بوائے چپّل نہیں کاٹتے۔" اس نے میری گردن کے نیچے کی ملائم کھال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں اوپر کیں اور کنکھیوں سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تو محبّت تھی لیکن وہ ہنس نہیں رہا تھا۔ میں نے اپنی گردن اس کے گھٹنے پر رکھ دی۔ تب جا کے کہیں اس کے چہرے پر ہنسی آئی۔

"چپّل نہیں کاٹتے" اس نے دہرایا تو میں نے دوسری چپّل دانتوں سے اٹھا کر اس کے پاس رکھ دی اور اس نے مجھے دل سے معاف کر دیا۔

اس دن تو خالی ڈانٹ پڑی تھی لیکن ایک دن پٹائی بھی ہوئی۔

ہوا یہ کہ کسی نے گیٹ کھٹکھٹایا۔ میں زور سے بھونکا اور تھوڑی دیر تک برابر بھونکتا رہا لیکن دراز سے کوئی دکھائی نہ دیا۔ ابھی میرا غصّہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ زمین پر مجھے کاغذ کا ایک ٹکڑا نظر آیا۔ میں نے اس آدمی کا بدلہ اسی کاغذ سے لیا کیونکہ ہو نہ ہو یہ اسی نے پھینکا تھا۔ میں نے اس کا ایک کونہ پنجے سے دبایا اور دوسرا دانتوں سے پکڑ کر کھینچا تو اس کے اندر سے ایک بڑا اور ذرا موٹا اور چکنا کاغذ نکلا۔ میں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ اور آرام سے دیوار کی چھاؤں میں لیٹ گیا۔ اپنے حساب سے میں نے بہت اچھا کام کیا

تھا۔ کسی کو میرے گھر کا گیٹ کھٹکھٹانے اور کاغذ اندر پھینکنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد مالکن باہر آئی تو میں اس کی مٹھی دیکھنے لگا جس میں کبھی کبھی ہڈّی دبی رہتی تھی لیکن اس کے ہاتھ خالی تھے اسی وقت اس کی نظر پھٹے ہوئے کاغذوں پر پڑی تو اس نے جھک کر ایک ایک ٹکڑا اٹھانا شروع کیا اور مجھے زور سے ڈانٹا۔

"یہ کیا کیا" اس نے کہا۔

میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ خوب شاباشی ملے گی لیکن یہاں تو ڈانٹ پڑ رہی تھی اور وہ روہانسی ہو گئی تھی۔ پھر اس نے وہیں بیٹھ کر کاغذ کے ان ٹکڑوں کو زمین پر جمانا شروع کیا۔ بیچ بیچ میں وہ مجھے غصّہ سے دیکھتی بھی جاتی تھی۔ میں چور بنا بیٹھا رہا۔

اس وقت اور کچھ نہیں ہوا اور میں تھوڑی دیر میں سب کچھ بھول گیا لیکن شام کو جب میرا مالک آیا تو اس نے روز کی طرح چھترا ایسا مزیدار ڈلا میری پلیٹ میں رکھ دیا میں پلیٹ کی طرف لپکا لیکن اس نے " نو " کہہ کر مجھے روک دیا۔ پھر اپنے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں ایک دوسرے سے کس کے ملائیں۔ ذرا سی دیر بعد جانے کیسے اس کی انگلیوں سے دو بار "چٹ چٹ" کی آواز نکلی۔ اس آواز سے تو میری سمجھ میں کچھ خاک نہ آیا لیکن جب اس نے " بس " کہا تو میں اس مزے دار ڈلے پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے پیار سے میری پیٹھ اور سر سہلایا اور گھر کے اندر چلا گیا۔ ابھی میں اسے پوری طرح کھا بھی نہ پایا تھا کہ وہ گھر کے اندر سے نکلا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پتلی سی وہی چھڑی تھی جسے لے کر وہ مجھے ٹہلانے جاتا تھا اور دوسرے ہاتھ میں کاغذ کے ٹکڑے۔ میں کچھ سمجھے بغیر اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ لیکن جب اس نے کاغذ کے وہ ٹکڑے میرے سامنے پکّے فرش پر پھینک دیے تو میرا خون خشک ہو گیا۔

" یہ کیا کیا " وہ گرجا۔

وہ مزے دار ڈلا اب بھی میرے منہ میں تھا مگر ڈر کے مارے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا اور میں اسے کھانا بھول کر سر جھکائے کھڑا رہا ۔

" پھر پھاڑو گے کاغذ " اس نے کہا اور چھڑی میری پچھلی ٹانگ پر ماری۔ چوٹ تو ضرور لگی لیکن مجھے اس سے زیادہ دکھ یہ تھا کہ مالک نے مجھے مارا۔ اس نے پھر چھڑی اٹھائی میں دُبک گیا۔ لیکن اس نے مارا نہیں بلکہ میرے پاس بیٹھ گیا اور میری پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا ۔

" گڈ بوائے کاغذ نہیں پھاڑتے ۔"

وہ میرا سر پیٹھ اور وہ جگہ جہاں اس نے مارا تھا پیار سے دھیرے دھیرے سہلاتے ہوئے بار بار کہتا رہا " یو آر اے گڈ بوائے کانگ۔ گڈ بوائے کاغذ نہیں پھاڑتے۔"

اس دن مجھے معلوم ہوا کہ میرا نام "کانگ" تھا ۔

دو تین دن بعد میں برآمدے میں کھڑکی کے پاس لیٹا تھا کہ کسی نے دھیرے سے گیٹ کھنکھٹایا اور کوئی چیز بھد سے اندر گری۔ میں لپکا اور اس پر دانت مارنے والا ہی تھا کہ اس دن کی مار یاد آ گئی اور میں اسے پنجے کے نیچے دبا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میرے مالک کی چھوٹی بہن باہر نکلی تو مجھے دیکھ کر خوب زوروں سے ہنسنے لگی ۔ میں کیا جانوں وہ کیوں ہنس رہی تھی ۔ پھر وہ میرے پاس آئی اور میرے پنجے کے نیچے سے وہ موٹی سی چیز نکال کر " گڈ بوائے " کہتی ہوئی اندر چلی گئی ۔ ذرا سی دیر میں وہ پھر باہر آئی اور اس نے وہی مزے دار ڈلا میری پلیٹ میں ڈال دیا۔ میں اسی طرح لیٹا رہا۔ اس نے چٹکی بجائی تو میں نے لیٹے ہی لیٹے منہ بڑھا کر اسے کھانا شروع کر دیا اور وہ " گڈ بوائے" کہتی ہوئی اندر چلی گئی ۔

مجھے بڑا اچھا لگا ۔

اب میں " گڈ بوائے" ہو گیا تھا ' جبھی تو دن میں بھی مجھے ایسی اچھی چیز کھانے کو ملی تھی

اس کا نام مجھے بہت دنوں بعد سمجھ میں آیا۔ سب لوگ اسے "ڈاگ بسکٹ" کہتے تھے لیکن وہ اتنی اچھی چیز کیوں نہیں کھاتے تھے یہ میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔

میرے مالک کی چھوٹی بہن کا نام بہت چھوٹا سا تھا اور وہ تھی بھی چھوٹی سی۔ میں اس کا نام کچھ کچھ پہچاننے لگا تھا لیکن اس کے نام میں ایسی ملائم سی آوازیں تھیں کہ بہت دنوں تک تو میں بس " رین " ہی سمجھتا رہا۔ ایک دن میرا مالک بہت دیر بعد گھر آیا۔ بہت گرمی پڑ رہی تھی۔ وہ شاید بہت تھکا ہوا تھا۔ یہ مجھے ایسے معلوم ہوا کہ اس نے روز کی طرح ذرا دیر کیلئے میرے پاس بیٹھ کر نہ تو میری پیٹھ سہلائی نہ میری گردن اور سر کو دونوں ہاتھوں میں لے کر انھیں تین چار بار پیار سے دبایا۔ بس مجھے چھوتا ہوا دروازہ کی طرف بڑھ گیا۔ اور دروازہ پر لگا گھنٹی کا بٹن دبایا۔ گیٹ کے باہر سے گھنٹی وہ پہلے ہی بجا چکا تھا۔ ٹن ٹن کی ہلکی سی آواز میں پہلے ہی سن چکا تھا۔ اس نے گھنٹی دوبارہ بجائی اور زور سے دروازہ بھڑ بھڑایا اور آواز دی۔

" زرّین۔ زرّین"

دروازہ کھلا تو وہی لڑکی جسے میں " رین " سمجھتا تھا سامنے کھڑی تھی۔ اس دن اس کا اصلی نام میری سمجھ میں آیا۔ میرا مالک تو اسے نام لے کر ہی پکارتا تھا لیکن مالکن اور سفید بالوں والا اسے بیٹی بھی کہتے تھے۔ میں کبھی کبھی چکرا جاتا، کیا اس کے دو نام ہیں۔ میرا تو ایک ہی نام ہے "کانگ" اسی وقت مجھے خیال آیا کہ مجھے بھی تو گھر کے لوگ کبھی کبھی "گڈ بوائے" کہتے ہیں۔ مجھے یہ دوسرا نام بہت اچھا لگتا تھا اور مالکن اور سفید بالوں والے کے نام مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکے۔ کوئی ان کا نام لیتا ہی نہ تھا۔ جانے کیوں۔ اور میرا مالک ـــــ اس کا نام ـــــ ساجد ـــــ تو ہر ایک کی زبان پر رہتا تھا، ہر شخص اسے نام لے کر پکارتا اس لیے سب سے پہلے مجھے یہی نام یاد ہوا تھا۔ اس کے دو چار جاننے والے روز ہی آتے تھے وہ بھی اسے ساجد ہی کہہ کر آواز دیتے۔ مجھے اس کا نام بھی بڑا پیارا لگتا تھا۔

اب مجھے اپنے مالک سفید بالوں والے اور زرّین کے آنے جانے کے وقت کا بھی کچھ کچھ اندازہ ہوگیا تھا۔ گھر کی مالکن تو بس کبھی کبھی ہی کہیں جاتی۔ زرّیں آتی تو میں گیٹ کے پاس آکھڑا ہوتا۔ اور جیسے ہی وہ داخل ہوتی اچک کے تھیلے پر دونوں ہاتھ رکھ دیتا۔ وہ میرے سر پر دھیرے سے چپت لگاتی جو مجھے بہت اچھا لگتا۔ شاید میں اس کا انتظار اسی پیار بھرے چپت کے لیے کرتا تھا۔ اپنے مالک، ساجد کے قدموں کی آواز تو میں بہت دور سے سن لیتا تھا۔ اس کی تو بات ہی اور تھی۔ مجھے "گڈبوائے" سب سے زیادہ وہی کہتا تھا۔ میں چاہتا بھی سب سے زیادہ اسے ہی تھا اور ڈرتا بھی۔ جیسے ہی مجھے اندازہ ہوتا کہ وہ آرہا ہے میں گیٹ پر اگلی دونوں ٹانگیں رکھ کر کھڑا ہوجاتا تھا۔ یہ بات اسے معلوم تھی اس لیے وہ دونوں پٹ باہر کی طرف کھولتا اور میری گردن اور سر دونوں ہاتھوں میں لے کر تیزی سے ملتا۔ مجھے بڑا اچھا لگتا۔ تھوڑی دیر میرے ساتھ کھیلنے کے بعد ہی وہ گھر میں جاتا۔ سفید بالوں والا اس وقت آتا جب سورج کو ریل کی پٹری کے پار زمین میں چھپے ہوئے بھی دیر ہوگئی ہوتی۔ دن میں پندرہ بیس اسکوٹریں تو میرے گھر کے سامنے سے روز گذرتی ہوں گی۔ پر میں چپ چاپ بیٹھا رہتا یا جو بھی کر رہا ہوتا اسی میں لگا رہتا۔ لیکن اس کے اسکوٹر کی آواز سب سے الگ تھی۔ میں دور ہی سے پہچان لیتا۔ اور جیسے ہی وہ اسکوٹر کھڑی کر کے گیٹ کھولتا میں خوشی کے مارے بے چین ہوجاتا۔ پھر وہ اسکوٹر اندر لاتا اور میں دوڑ کر دروازہ بھڑ بھڑاتا۔ اسے گھنٹی بجانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ نہ تو وہ مجھے بہت زیادہ پیار کرتا نہ میرے ساتھ کھیلتا ہی لیکن ایسی ٹھنڈی نظروں سے مجھے دیکھتا کہ میں لوٹ لوٹ ہوجاتا۔ اور جانے کیا بات تھی کہ جب وہ گھر میں ہوتا مجھ پر ڈانٹ بھی نہ پڑتی۔ وہ مجھے کیا کسی کو بھی نہ ڈانٹتا تھا لیکن اس کی بات سب مانتے تھے ـــ میں بھی ـــ

میرے گھر کے آس پاس بس ایک کتا تھا۔ اس کی مالکن "اسکو گولو" کہہ کر پکارتی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر زور زور سے غرّاتا تو میرا مالک زمین سے پتھر اٹھا کر اس کی طرف پھینکتا بھی تھا۔ وہ تھوڑی دور بھاگ جاتا لیکن پلٹ پلٹ کے غرّاتا اور بھونکتا رہتا۔ غرّاتا اور بھونکتا تو میں بھی تھا۔ جتنی مجھ میں طاقت تھی' لیکن اس سے ڈرتا بھی تھا اور اس کی آواز سن کر اپنے مالک کے پیروں سے لگ کر کھڑا ہو جاتا۔

ایک دن میرا مالک مجھے ٹہلانے نکلا تو وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ ہم دونوں مزے سے چلے جا رہے تھے کہ ایک دم پارک کے نکڑ پر اس نے جانے کس طرف سے آکر میرے مالک پر حملہ کر دیا۔ مجھے بڑا غصہ آیا اور میں بھونکا بھی' اپنی پوری طاقت لگا کر' لیکن میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ میرے مالک نے اپنی کمر سے چوڑی اور ہی سی رسّی کھول کر اس پر خوب زور سے ماری اور وہ "پیں پیں" کرتا ہوا اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ میں بہت خوش ہوا۔ اس کی آواز سن کر دو تین لوگ اس کے گھر سے نکل آئے۔ میرے مالک اور ان لوگوں میں تھوڑی دیر تک خوب زور زور سے باتیں ہوتی رہیں۔

تھوڑے دنوں میں آس پاس کئی چھوٹے بڑے کتے جانے کہاں سے آ گئے' لیکن ان میں سے کوئی نہ مجھ سے بولتا تھا نہ میرے مالک سے۔ دن میں تو میں بس تھوڑی دیر کے لیے باہر لے جایا جاتا لیکن رات میں جب دیئے تو ہر طرف اندھیرا ہوتا لیکن جانے کیسے مکان اور پارک بلکہ اور آگے تک کی سڑک دکھائی دیتی' مجھے خوب ٹہلایا جاتا۔ پارک میں تھوڑی دیر کے لیے مجھے آزاد چھوڑ دیا جاتا اور میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک دوڑا دوڑا پھرتا۔ میں ذرا بڑا ہو گیا تھا اور مجھ میں خوب طاقت آگئی تھی۔ کیا مزے کے دن تھے۔ پھر ایک رات کو جب میں پارک میں دوڑ رہا تھا مجھے پوری ایک اینٹ ایک جگہ پڑی ہوئی دکھائی دی۔ مجھے اس کی بُو بڑی اچھی لگتی تھی۔ میں نے اپنے اگلے پیروں اور دانتوں سے اسے سیدھا کر کے اپنے منھ میں کس کے داب لیا اور وہاں سے پارک کے دوسرے کونے تک بھاگا بھاگا

چلا گیا۔ پھر وہاں سے دوسرے کونے تک خوب تیزی سے دوڑا۔ پاس ہی میرا مالک اور زرّین کھڑے تھے۔ دونوں زور سے تالی بجا رہے تھے۔ ان کی خوشی دیکھ کر میں نے سمجھ لیا کہ میں کوئی بہت اچھا کام کر رہا ہوں اور ایک بار پھر دوسرے کونے کی طرف دوڑا لیکن میرے مالک نے مجھے پارک کے بیچ ہی میں روک لیا اور میری پیٹھ، گردن اور سر پر بہت دیر تک پیار سے ہاتھ پھیرتا رہا۔

اپنے گھر واپس آکر میں نے برتن میں رکھا ہوا سارا پانی پی لیا۔ اس وقت پانی تو میں روز ہی پیتا تھا لیکن اتنا نہیں۔ پھر تو یہ روز کی بات ہو گئی۔ کبھی کبھی میں اینٹ گھر لے آتا تو اسی وقت جو بھی مجھے باہر لے گیا تھا اسے اٹھا کر پارک کے پاس والے درخت کی طرف پھینک دیتا۔

ان ہی دنوں جانے کیسے ایک دن مجھے اندازہ ہوا کہ میں خوب بڑا ہو گیا ہوں اور میرے پٹھے بہت مضبوط ہو گئے ہیں۔ اس وقت مجھے "گولو" بہت یاد آیا۔ مل جائے تو جھنجھوڑ ہی ڈالوں۔ میرے گلے میں ایک پٹا تو ہر وقت ہی پڑا رہتا تھا۔ اس میں ایک جگہ دو تین چھوٹے چھوٹے چمکدار گولے تھے۔ مجھے باہر لے جاتے وقت میرا مالک ہو یا زرّین یا پھر وہ سفید بالوں والا میری گردن کے پاس کچھ کھٹر پٹر کرتے اور میں ایک لمبی اور چوڑی سی رسّی سے بندھ جاتا۔ یہ تو مجھے بہت دنوں بعد معلوم ہوا کہ اسے "لیش" کہتے ہیں۔ اسے دیکھ کر مجھے وہ رسّی یاد آجاتی جسے کر سے کھول کر میرے مالک نے "گولو" کو مارا تھا اس لیے مجھے اچھی بھی لگتی لیکن اس کی وجہ سے مجھے مالک کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا اور سڑک کے کنارے پڑی ہوئی اینٹوں کو دیکھ کر مجھے بڑی لالچ آتی۔ کبھی کبھی میں پوری طاقت لگا کر جھٹکا دیتا لیکن یہ "لیش" ٹوٹتی نہ مالک کے ہاتھوں سے اسے چھڑا پاتا۔ ڈانٹ پڑتی تو پہلے کی طرح ساتھ ساتھ چلنے لگتا۔ پارک میں میری گردن کے پاس پھر کھٹر پٹر ہوتی اور میں دوڑنے بھاگنے کے لیے آزاد ہو جاتا لیکن مالک کے ہاتھ میں بھی وہ "لیش" مجھے

ایک آنکھ نہ بھاتی۔ میں اسے چھیننے کی کوشش کرتا تو وہ ہاتھ اونچا کر لیتا۔ میں دوڑتا ہوا آتا اور پاس آکر ہوا میں کودتا اور مالک کے کندھے تک پہونچ جاتا، وہ ہاتھ اور اونچا کر لیتا۔ کبھی اس کا کونا میرے منھ میں آجاتا تو دانتوں سے دبا کر اپنی طاقت بھر جھٹکے دیتا لیکن میرا مالک بھی بہت مضبوط تھا " چھوڑ دو، چھوڑ دو کانگ" میرا مالک کہتا تو میں اسے چھوڑ دیتا۔ ایک دن جانے کیسے وہ رسّی باہر رہ گئی۔ جیسے ہی میری نظر اس پر پڑی مجھے ایک دم غصّہ آگیا اور میں نے اپنے تیز نکیلے دانتوں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

شام کو جب زرّین اور میرے مالک نے اسے دیکھا تو مجھ پر خوب ڈانٹ پڑی میرا مالک تو بہت خفا تھا۔ میں چپ چاپ بیٹھا ہوا دوسری طرف دیکھ رہا تھا لیکن کنکھیوں سے ادھر بھی دیکھ لیتا تھا جہاں سب لوگ کھڑے تھے۔ میرے مالک کا غصّہ کسی طرح کم ہی نہیں ہو رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ دو چار ہاتھ تو پڑ ہی جائیں گے۔ اسی وقت گیٹ کھلا اور سفید بالوں والا آگیا۔ اسے دیکھ کر میری جان میں جان آئی کہ اب شاید پٹائی نہ لگے۔ اور ہوا بھی یہی۔

میں بھی کچھ کم شیطان نہ تھا۔ دروازہ کھلا پاتا تو چپکے سے گھر کے پیچھے والے کھیت میں دوڑا دوڑا پھرتا اور بہت سے چھوٹے چھوٹے درخت کچل ڈالتا۔ کبھی اپنا گدّا پھاڑ ڈالتا۔ ایک بار تو لمبا سا چکنا کپڑا میں نے چیتھڑے چیتھڑے کر ڈالا تھا۔ اس لیے ڈانٹ تو پڑتی ہی رہتی تھی۔ جب بھی ڈانٹ پڑتی میں دوسری طرف دیکھنے لگتا میری اس حرکت پر کبھی کبھی وہ لوگ ڈانٹتے ڈانٹتے ہنسنے لگتے۔ لیکن اس دن زرّین بہت غصّہ تھی۔ شاید وہ کپڑا اسی کا تھا۔ مجھے بھی اپنی بے وقوفی پر افسوس ہو رہا تھا۔ میں اسی طرح چپ چاپ بیٹھا دوسری طرف دیکھتا رہا۔ آخر زرّین کو ہنسی آ ہی گئی اور اس نے کہا۔

"میرا اتنا اچھا جمپر پھاڑ ڈالا اور کیسے بھولی بٹیر بنے بیٹھے ہیں"۔

یہ "بھولی بٹیر" کیا ہوتی ہے، مجھے کبھی نہ معلوم ہوسکا۔

اب میں آپ ہی آپ ہر وقت خوش رہتا۔ اپنی طاقت کے نشے میں مست۔ آس پاس کوئی کتّا میرا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ رات میں سامنے والے پارک اور اسکے چاروں طرف کی سڑک پر میری حکومت ہوتی کسی کی مجال نہیں تھی کہ میرے سامنے آ کر بھونک سکے۔

میرے گھر کے باہر گیٹ سے دوسرے مکان تک جھاڑیوں کی باڑھ لگی تھی۔ دن میں اور پھر شام کے وقت سڑک پر سے بہت سی بھینسیں گذرتیں تو جانے کیوں بیچ میں چلنے کے بجائے جھاڑیوں سے اپنا بدن رگڑتیں۔ مجھے ان کی یہ بات اچھّی نہ لگتی۔ آخر وہ میری چیز کیوں چھوتی ہیں۔ میں خوب بھونکتا، ایک کونے سے دوسرے کونے تک دوڑتا لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ لوہے کے دروازے پر اپنے دونوں اگلے پیر رکھ کر کھڑا ہوجاتا اور دونوں پٹوں کی بیچ کی جھری سے ان کالی کلوٹی بھینسوں کو دیکھ کر اپنا غصّہ اتارتا۔ ایک دن میری مالکن نے اس آدمی سے جو ایک لمبا سا ڈنڈا لیے ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا کچھ کہا لیکن اس نے جھاڑی کے پاس سے بھینس کو بھگایا نہیں۔ میں نے زور زور سے گیٹ پر بار بار ہاتھ مارا تو جانے کیسے اوپر کا کھٹکا کھسک گیا اور میں باہر نکل آیا۔ مالکن میرا نام لے لے کر بار بار مجھے اندر بلا رہی تھی لیکن میں اتنے غصّے میں تھا کہ مجھے بھینسوں کے علاوہ نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا اور نہ میں کسی کا حکم ماننے کے لیے تیار تھا۔ میں جلدی سے آگے بڑھ کر خوب زور سے بھونکا اور اپنے تیز اور لمبے دانت باہر نکال کر اس بھینس کی طرف جو اب بھی جھاڑی سے اپنا بدن کھجا رہی تھی، بڑھا تو اس نے اپنا بھاری سر اور سینگ گھمائے۔ میں پہلے تو ڈر کے ذرا سا دُبکا پھر جھکائی دے کر اس کے پیچھے چلا گیا اور اپنی پوری طاقت سے بھونکنے لگا۔ اس نے اپنی پچھلی ٹانگ سے مجھے مارنے کی کوشش کی۔ میں نے

پھرتی سے اپنا بدن پیچھے کرلیا اور کود کر اس کی دم پکڑ لی ۔ وہ بھاگی اور اس کے ساتھ دوسری بھینس بھی ۔ میں نے اس کی دُم نہ چھوڑی اور دانتوں سے اسے خوب زور سے دبالیا ۔ پھر جب وہ نالے پر رکھا ہوا پتھر پار کر کے ریل کی پٹری کے پاس کی گیٹیوں پر چڑھنے لگی تو میرے کانوں میں آواز آئی "کانگ کم ۔ کانگ کم" میں نے دُم چھوڑ دی اور اپنی کامیابی پر خوش خوش گھر کی طرف بھاگا ۔ مارے خوشی کے میرے پیر زمین پر نہیں پڑ رہے تھے ۔ اس دن پہلی بار میں نے اپنی طاقت دیکھی ۔ میری آواز سن کر کئی کتے سڑک پر آ گئے تھے لیکن وہ مجھ سے دور دور ہی رہے ۔ کسی کو میرے پاس آنے کی ہمت نہیں ہوئی ۔ ان میں "گولو" نہیں تھا ورنہ میں اسے بھی مزہ چکھا دیتا ۔

گیٹ کے پاس سے میری مالکن نے دھیرے سے کہا "کم" اور میں گھر میں چلا گیا ۔ اس دن کے بعد سے بھینسوں نے میرے گھر کی جھاڑیوں کو چھونا چھوڑ دیا ۔ سورج ذرا آسمان میں اوپر ہو جاتا تو میں گیٹ کے پاس آکر بیٹھ جاتا ۔ جیسے ہی بھینسوں کے پیروں کی آواز آتی میں زور سے غرّاتا اور بھونکتا ۔ وہ بھینسیں سڑک پر تیز تیز چلتی ہوئی ریل کی پٹری کی طرف بڑھنے لگتیں ۔ پھر میں دن کا کھانا کھا کر اپنے گدّے پر سو جاتا ۔

۴

ایک دن صبح صبح گیٹ کے باہر سے کسی نے گھنٹی بجائی تو میں زور سے بھونکا ۔ زرّین کے "نو کانگ" کہنے پر میں چپ تو ہو گیا لیکن بالکل تیار کھڑا رہا ۔ ویسے تو جب بھی گھنٹی بجتی پہلے کوئی نہ کوئی پوچھتا "کون ہے؟" اور پھر دروازہ کھولتا ۔ لیکن اس دن جانے کیا بات تھی کہ سارے لوگ خوش خوش ایک ساتھ گیٹ کے باہر نکل آئے ۔ زرّین نے میرے گلے کا پٹہ پکڑ لیا اور میں خاموش کھڑا سب کو دیکھتا رہا ۔ آنے والوں میں ایک مرد تھا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا ، یا شاید دیکھا ہو ۔ ٹھیک سے یاد نہیں ۔ ایک عورت تھی جس کی صورت پہچانی پہچانی لگ رہی تھی اور ایک پیارا پیارا بچّہ ۔ مالکن نے اس

عورت کو لپٹا لیا۔ سفید بالوں والے نے اس آدمی کو سینے سے لگایا اور اس بچّے کو گود میں لے کر پیار کرنے لگا۔ زرّین بھی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ میری سمجھ میں یہ تو نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے لیکن میرے گھر کے لوگ خوش تھے اس لیے میں بھی خوش تھا اور پیار سے اس بچّے کو دیکھ رہا تھا۔ بڑا پیارا تھا وہ بچّہ۔ سفید بالوں والے کی انگلی پکڑ کر گیٹ سے اندر جاتے ہوئے وہ کنکھیوں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ شاید مجھ سے ڈر رہا تھا۔ میں اسے پاس سے دیکھنے کے لیے ذرا آگے بڑھا تو وہ سفید بالوں والے کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ زرّین نے پٹّا کھینچ کر مجھے پیچھے کر دیا۔ مجھے بہت برا لگا۔ میں تو اتنا پیار کر رہا ہوں اور وہ ڈرا جا رہا ہے لیکن میں ایک بار بھی نہیں بھونکا۔

دھیرے دھیرے سب لوگ گھر میں چلے گئے اور دروازہ بند کر دیا گیا۔

مجھے یہ سب لوگ اچھے لگے، لیکن بچّے کی بات ہی اور تھی، گورا گورا گول مٹول۔ اب تو مجھے اس کا ڈرتے ہوئے اپنی طرف دیکھنا بھی اچھا لگتا تھا۔ وہ جب بھی گھر کے باہر آتا کوئی نہ کوئی اس کے ساتھ ضرور ہوتا۔ میں اسے پیار سے دیکھتا رہتا لیکن اس کا ڈر پوری طرح ختم نہ ہوا تھا۔ یہ بات دوسری ہے کہ جب میں ذرا دور ہوتا تو وہ میری طرف ہاتھ ہلا کر کہتا "کانگ کانگ" اس کے منھ سے اپنا نام سن کر میں بہت خوش ہوتا اور جب بھی اسے دیکھتا تھوڑی دوری پر دیوار کے سائے میں بیٹھ جاتا۔ اب تو وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ اچھا لگنے لگا تھا۔

ایک دن جانے کیسے وہ اکیلے ہی گھر کے باہر آگیا، شاید گیند اٹھانے کے لیے، جو لڑھکتی ہوئی لان میں آ گئی تھی۔ اس کی مجھ پر نظر نہیں پڑی۔ میں گملوں کے پاس لیٹا لیٹا اسے دیکھتا رہا۔ پھول دار قمیص اور پینٹ میں وہ بہت پیارا لگ رہا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے تیزی سے اچک کر اگلے پیر اس کے کندھوں پر رکھ دیے اور اس کے منھ پر پیار کر لیا۔ اس نے ایک چیخ ماری اور روتا ہوا اندر بھاگا۔ باہر کے کمرے

میں شاید کئی لوگ آ گئے تھے۔ ان کی آوازیں تو آ رہی تھیں لیکن وہ کیا کہہ رہے تھے میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں روتے روتے اس نے کہا "کانگ ماموں نے پیار کر لیا۔"

میں حیران و پریشان کھڑا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے پیار کرنے سے کسی کو ڈر کیسے لگ سکتا ہے۔ مجھ پر ڈانٹ بھی پڑی۔ کیوں؟ یہ میں کیا جانوں۔ میں نے تو بس پیار کیا تھا ـــــ کچھ دنوں بعد وہ سب چلے گئے۔ جاتے وقت پیار سے اس بچے نے اپنے باپ کی گود سے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور ڈرتے ڈرتے کہا:-

"کانگ ماموں ٹاٹا"۔

اس سے میٹھی آواز میرے کانوں میں پہلے نہ پڑی تھی۔ آخر میرے پیار نے اثر دکھا ہی دیا۔ میں نے سوچا۔ وہ سب ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ میری مالکن تو رو رہی تھی۔ پھر ایک چھوٹی سی گاڑی میں بیٹھ کر وہ سب چلے گئے۔ میں دور تک اس گاڑی کو دیکھتا رہا۔ اسی میں تو وہ بچہ بیٹھا ہوگا جس نے مجھے "کانگ ماموں" کہا تھا۔ یہ "ماموں" ضرور کوئی اچھی بات ہوگی۔ میرے مالک کو بھی تو وہ "ماموں" کہتا تھا۔

۵

اب میں اپنے مکان کے آس پاس کے حصے کا بادشاہ تھا۔ بس ایک "گولو" تھا اور اس کا ساتھی "چھنگو" جو کبھی کبھی مجھ کو چھیڑتے۔ محلے کے دوسرے سارے کتے مجھے دیکھتے ہی ڈر کے مارے ادھر ادھر ہو جاتے تھے۔ ایک دن بہت سے کتوں نے ایک ساتھ میرے گھر کے سامنے آکر بھونکنا شروع کیا۔ میں سمجھا ایک دوسرے سے لڑ رہے ہوں گے اس لیے خاموش بیٹھا رہا۔ اتنے میں "چھنگو" نے جھاڑی سے اپنا منہ نکالا۔ اسے دیکھتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں چھلانگ لگا کر وہاں پہونچا تو وہ کھسک کر باہر ہو گیا۔ میں سمجھ گیا یہ "گولو" ہی کی شرارت ہے۔ لیکن پوری طاقت سے بھونکنے کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ گیٹ بند تھا۔ میں نے اسے زور سے دھکا دیا لیکن کھٹکا نہ کھلا۔ غصہ کے

مارے میرا خون کھول رہا تھا۔ اس لیے میں کبھی جھاڑیوں کے پاس سے اور کبھی گیٹ پر آ کر غرّاتا اور بھونکتا رہا۔ اتنے میں وہ موٹی سی عورت آ گئی جو میرے گھر میں کام کرتی تھی۔ میرے کھانا کھانے اور پانی پینے کے برتن بھی وہی صاف کرتی تھی۔ کبھی کبھی میرے لیے قیمہ بھی لاتی تھی۔ اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا میں باہر نکل کر ان کتوں پر جھپٹا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سارے کے سارے بھاگے۔ بھاگنے والوں میں سب سے آگے "گولو" تھا اس کے پیچھے "جھبنکو"۔ میں نے اور کسی کی طرف دیکھا بھی نہیں، بس ان دونوں کے پیچھے لپکا۔ لیکن پارک کے کونے تک پہونچنے کے بعد جب وہ کہیں دکھائی نہ دیے تو میں رک کر غرّانے لگا۔ اتنے میں مجھے اپنا نام سنائی دیا، کوئی مجھے پکار رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو گیٹ کے باہر وہی موٹی عورت کھڑی تھی۔ میں گھر کی طرف لوٹا لیکن پلٹ پلٹ کے دیکھتا بھی جاتا تھا۔ "گولو" اور "جھبنکو" کہیں دکھائی نہ دیے۔ اس دن سے سارے کتوں پر میرا دبدبہ بیٹھ گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ بے کار ڈرتے تھے۔ میں یوں ہی ان پر حملہ تھوڑی کرتا۔ میرا مالک بہت سخت تھا۔ مجھے خود سے کسی کو چھیڑنے کی اجازت نہیں تھی۔

وہ دن بھی کیسے پیارے تھے۔ بھلائے نہیں بھولتے۔ جاڑوں میں گیٹ کے پاس پکّی زمین پر ملائم سے گدّے کے اوپر لیٹے لیٹے چاروں طرف کے پھولوں سے لدے ہوئے پودوں کو دیکھنا، بیچ میں ایک آدھ جھپکی مار لینا، کوئی مکھی ناک یا کان پر بیٹھ جائے تو ہاتھ ہلائے بغیر دھیرے سے غرّا کر اسے اڑا دینا، گیٹ پر کوئی ہاتھ بھی لگا دے تو بھونک بھونک کر اس کی سٹّی بٹّی گم کر دینا اور شان سے، ادھر ادھر دیکھے بغیر، شریفے، امرود اور پپیتے کے پیڑوں کے پاس سے ہوتے ہوئے، دروازہ کھلا ہو تو مکان کے پیچھے کے کھیت میں نکل جانا اور بدن سمیٹے دھیرے دھیرے دوڑتے ہوئے اس جگہ تک پہونچ کر جہاں کانٹے دار تار لگے تھے، دور دور تک پھیلے ہوئے اونچے اونچے درختوں کو دیکھنا۔

کیسے پیارے سے تھے وہ دن۔

کانٹے دار تاروں سے تھوڑا آگے ایک نالا تھا، اس طرف سے نیولے آجاتے تھے۔ شروع شروع میں تو میں انھیں دوڑاتا اور وہ بھاگ جاتے لیکن پھر دوستی ہو گئی اور میں نے انھیں دوڑانا چھوڑ دیا۔ وہ مکان کے پیچھے کی دیوار کے پاس کے چھپّر سے جس میں جلانے کیا کیا بھرا تھا نکلتے تو میں انھیں چپ چاپ دیکھا کرتا، کچھ نہ بولتا، لیکن کھیت میں کھلنے والے دروازہ کی طرف بڑھتے ہوئے وہ مجھے پلٹ پلٹ کے دیکھتے ضرور۔ پرانے دنوں کا ڈران کے دلوں میں سمایا ہوا تھا۔ مجھے یہ لمبوترے سے نیولے جو زمین سے چپکے چپکے دوڑتے اب اچھے لگنے لگے تھے، ان کا ڈرنا بھی اچھا لگتا تھا۔ گھر کے باہر کے کتّوں کی طرح انھیں بھی سہما سہما دیکھ کر میرے دل میں اپنے طاقتور ہونے کا احساس اور بھی بڑھ جاتا لیکن دل میں ایک کانٹا اب بھی چبھا ہوا تھا "گولو" اور "جھنگو" ویسے تو میرے سامنے نہ آتے لیکن جب بھی میں ان کے گھر کے سامنے سے گذرتا مجھے دیکھ کر خوب بھونکتے۔ ایک دن پارک کے نکڑ کے پاس میں نے یوں ہی پلٹ کر دیکھا تو دونوں جھاڑیوں میں ایسے بیٹھے تھے جیسے حملہ کرنے ہی والے ہوں۔ کون جانے مجھے بے خبر دیکھ کر پیچھے سے حملہ کر دیتے۔ یہ طاقت کا نشہ برا ہوتا ہے اس میں ڈر بھی سمایا رہتا ہے۔

اور ایک دن وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس دن میں اپنے مکان کا گیٹ کھلتے ہی چپکے سے باہر نکل گیا تھا۔ مالکن کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ اصل میں مجھے پیشاب بڑے زور سے لگا تھا اور کچھ جی بھی چاہ رہا تھا کہ "لیش" کے بغیر تھوڑی دیر گھوم لوں۔ بڑے والے مکان سے ذرا آگے، پارک کی دیوار کے پاس، پیر اٹھا کر پیشاب کر رہا تھا کہ ان دونوں نے ایک دم حملہ کر دیا۔ ذرا دیر تو مجھے سنبھلنے میں لگی اس کے بعد میں غرّایا تو گولو نے پینترا بدل کر میری ٹانگ اپنے دانتوں میں دبانے کی کوشش کی بلکہ دبا بھی لی۔ اب مجھے سچ مچ غصہ آگیا۔ اور میں نے پلٹ کر اس کی گردن پر وار کیا تو اس کے منھ سے میری ٹانگ چھوٹ گئی۔ مجھے

منھ میں کچھ سیٹھا سیٹھا محسوس ہوا لیکن میں نے اپنے دانت گاڑے گاڑے آگے کے داہنے ہاتھ کے نیچے سے اس کی ناک نوچ لی۔ وہ زمین پر گر گیا تو "چھنکو" بھاگا اور "گولو" نے بھی زور لگا کر جھٹکے سے اپنی گردن چھڑالی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ تو زرّین نے جو لڑائی کی آواز سن کر باہر نکل آئی تھی میرا پٹا نہ پکڑ لیا ہوتا تو میں ان دونوں کو حملہ کرنے کا مزہ چکھا دیتا۔ لیکن خیر۔ اس دن کے بعد سے ان دونوں کی پھر کبھی ہمت نہ ہوئی کہ مجھ پر حملہ کریں۔ اور میں جب بھی آس پاس یا سامنے سے گذرتا تو ان کے گھر کی طرف منھ کر کے کم از کم غرّاتا ضرور۔ وہ بھی غرّاتے لیکن بس اس وقت جب ان کی مالکن وہاں ہوتی۔ ان کی آواز سن کر میں سلاخوں والے پھاٹک کی طرف منھ کر کے اس وقت تک بھونکتا رہتا جب تک وہ انھیں لے کر اندر کمرے میں چلی نہ جاتی۔

۶

یاد نہیں یہ انھی جاڑوں کی بات ہے یا پچھلے جاڑوں کی۔ گھر کے سارے لوگ ایک ایک کر کے کہیں چلے گئے، بس زرّین رہ گئی۔ وہ موٹی سی عورت جو میرے برتن دھوتی تھی ان دنوں گھر ہی میں رہتی۔ بس کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لیے کہیں چلی جاتی۔ باقی سارے لوگوں کو میری آنکھیں ڈھونڈھا کرتی تھیں لیکن کوئی دکھائی نہ دیتا۔ گھر سونا سونا لگتا۔ کھانا تو مجھے پہلے ہی کی طرح دونوں وقت پیٹ بھر ملتا لیکن جب سے وہ لوگ گئے تھے مجھے ہڈّی نہیں ملی تھی۔ اس کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے ـــــ شام ہونے لگتی تو زرّین کوٹ پہنا کر اس کی ڈوریاں میرے پیٹ پر باندھ دیتی۔ سردی تو پھر بھی لگتی لیکن میں ساری رات گھر کی رکھوالی کرتا رہتا۔ دن کو نیند پوری نہ ہوتی تو شام کو ذراسی دیر کے لیے سو جاتا۔ سوتا کیا بس ذراسی انگھائی لے لیتا۔ ایک شام میں ذرا آنکھ بند کر کے لیٹا ہی تھا۔ شاید آنکھ بھی نہ لگنے پائی تھی کہ زرّین کی آواز سنائی دی۔ ڈری ڈری آواز۔ میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور گردن اونچی کر کے سونگھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک اجنبی سی بو ناک سے ٹکرائی۔ میں بھونکتے ہوئے چھپّر کی طرف بڑھا ہی تھا کہ گیٹ کے پاس کچھ کھٹ پٹ

سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو پہلے زرّین نظر آئی اس کے بعد وہ موٹی سی عورت جو میرے یہاں کام کرتی تھی۔ دونوں گھبرائی گھبرائی سی لگ رہی تھیں۔ میں ان کی طرف لپکا۔ وہ عورت زرّین کو پڑوس کے ایک گھر میں چھوڑنے جا رہی تھی۔ میں ساتھ ہو لیا اور اس مکان کے باہر اس وقت تک کھڑا رہا جب تک زرّین دروازہ کھول کر اندر نہیں چلی گئی۔ اس کے بعد دوڑتے ہوئے چھت تک گیا لیکن وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ بُو ضرور تھی۔ میں تھوڑی دیر تک وہاں کھڑا ہوا بھونکتا اور غرّاتا رہا۔ اس وقت مجھے اپنے آپ پر بھی غصّہ آ رہا تھا۔ آنکھ نہ جھپکی ہوتی تو اسے بھنبھوڑ ہی ڈالتا۔

کچھ روز بعد سب لوگ آ گئے اور میں صبح کے وقت اور شام میں پھر ٹہلنے جانے لگا۔ ویسے تو میرا مالک جب مجھے ٹہلانے لے جاتا تو خوب مزا آتا، وہ اچھل کود بہت کرتا لیکن سفید بالوں والے کے ساتھ دوسرا ہی مزہ آتا۔ ایک تو آزادی زیادہ رہتی، بات بات پر ڈانٹ نہ پڑتی، اور میں آوارہ پھرنے والے اور ان بڑے چھوٹے کتّوں پر جو اپنے اپنے مالکوں کے ساتھ ہوتے دھونس بھی زیادہ جما پاتا۔ میں خود سے تو کسی سے بولتا نہیں تھا۔ غصّہ بھی مجھے دیر میں آتا تھا لیکن ڈرتا بھی کسی سے نہ تھا۔ ایک دن جب میں اس سفید بالوں والے (کیا کروں مجھے اس کا نام ہی نہیں معلوم۔ کوئی اسے نام لے کر پکارتا ہی نہ تھا۔ نہ جانے کیوں) کے ساتھ صبح صبح اپنے محلّے سے نکل کر چوڑی سڑک پر جا رہا تھا، چھ سات کتّوں نے مجھے یک دم گھیر لیا اور لگے بھونکنے۔ میں نے زور کا جھٹکا دیا تو جانے کیسے لیش سے میری گردن آزاد ہو گئی۔ میں زور سے غرّایا۔ اس وقت غصّہ کے مارے میرا برا حال تھا۔ میں نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا اور ان میں سے سب سے مضبوط کتّے کی طرف چھلانگ لگا کر اس کی ٹانگ دبوچ لی۔ دوسرے کتّے تو دھیرے دھیرے "بھوں بھوں" کرتے ہوئے بھاگے اور وہ جس کی ٹانگ میرے جبڑے میں دبی تھی "ییں ییں" کرنے لگا۔ سفید بالوں والے نے مجھے زور سے ڈانٹا اور "نو کانگ لیو ہِم" کہا۔ لیکن اس وقت تو مجھ پر بھوت سوار تھا۔ میں نے دانت اور زور سے اسکی

ہڈیوں میں گاڑ دیے۔ وہ تکلیف کے مارے زمین پر گر گیا۔ اب مجھے اس پر کچھ کچھ رحم بھی آنے لگا تھا۔ اسی وقت چھڑی میری پیٹھ پر پڑی اور میں نے اس کی ٹانگ چھوڑ دی۔ وہ لنگڑاتا ہوا بھاگا اور سڑک کے کنارے کی دو دکان کے پیچھے چھپ گیا۔ واپسی میں سفید بالوں والے نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے خفا ہے۔ جب بھی کوئی ایسی ویسی بات ہوتی وہ بس چپ ہو جاتا۔ ویسے بھی وہ بہت کم بولتا تھا۔

انہی دنوں مجھے پہلی بار ایک کتیا اچھی لگی۔ میری ہی طرح کالی بھوری اور لمبائی چوڑائی میں مجھ سے بس ذرا سی کم ــــ میں تیزی سے اس کی طرف لپکا تو میرے مالک نے "لیش" کھینچ لی۔ اس وقت میرے بدن کی ایک ایک بوٹی تھرک رہی تھی اور میں جس طرح بھی ہو اس تک پہونچ جانا چاہتا تھا لیکن وہ اپنے مالک کے ساتھ میری محبت سے انجان بنی چلی جا رہی تھی۔ مجھے اس کی یہ بات اچھی نہیں لگی اور میں اسی طرف دیکھتا رہا۔ اس وقت تک جب وہ تیسرے موڑ پر ایک دم میری نظروں سے غائب ہو گئی۔ میں بہت دیر تک اس کے بدن کی خوشبو سونگھتا رہا۔ میٹھی میٹھی خوشبو اور پھر یہ بو میری ناک میں بس گئی۔

شام کے وقت میں باہر نکلتا تو پارک کے کونے پر جھاڑیوں کے پاس، بجلی کے کھمبے سے چپکی کھڑی اور بالو میں لیٹی ہوئی کئی کتیاں دکھائی پڑتیں۔ ان میں سے بس ایک کے بال چمکدار تھے اور ڈیل ڈول میں بھی اچھی تھی لیکن اسی وقت وہ مجھے یاد آجاتی جس نے بس ایک جھلک دکھا کر مجھے اپنا بنا لیا تھا۔ دوسری بار تو اسے دیکھنا نصیب ہی نہیں ہوا ــــ

پھر کئی دنوں بعد پارک میں دوڑتے دوڑتے میں بائیں طرف اس جگہ جہاں ریت کا ڈھیر لگا تھا کو دا تو وہی چمکدار کتیا جیسے میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا لیکن جوں ہی اسے سونگھنے کے لیے میں نے اپنی ناک بڑھائی بدبو کا ایسا زبردست بھبکا آیا کہ میرا سارا عشق ہرن ہو گیا۔ اور میں پارک کی منڈیر پر چڑھ گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اسی وقت میرے مالک نے جو ایک کونے میں لوہے کی سلاخوں کے پاس کسی سے

باتیں کررہا تھا، مجھے آواز دی اور میں ہوا سے باتیں کرتا ہوا اس کے پاس پہونچ گیا۔

ان دنوں مجھے لگتا جیسے گھر کا ہر شخص جو بھی کام کرتا ہے وہ میرے لیے ہی ہوتا ہے۔ میرا مالک باہر صرف اس لیے جاتا ہے کہ میرے لیے "ڈاگ بسکٹ" لائے، سفید بالوں والا موم پھلیاں لینے، ایک لمبا سا سفید ڈبہ صرف اس لیے تھا کہ اس میں میرا دودھ اور قیمہ رکھا جائے، مالکن کا کام بس میرے لیے کھانا پکانا تھا اور میرے برتن دھونے اور میرے بیٹھنے کی جگہ صاف کرنا نہ ہوتا تو وہ موٹی عورت کیوں آتی۔ زرّین تو ہر وقت میری دیکھ بھال کیا ہی کرتی تھی۔ مجھے باہر آنگن میں چھوڑ کر وہ اپنے کمرے میں چلی جاتی تو مجھے بہت برا لگتا۔ پھر میں سوچتا شاید سو رہی ہو آخر میں بھی تو دن میں کئی بار سوتا تھا لیکن اس کا کتاب لے کر بیٹھ جانا اور سفید بالوں والے کا اپنے آپکو کمرے میں بند کرلینا مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا۔

مجھے کھانے کو خوب بہت سا ملتا اور وہ بھی مزیدار۔ قیمے میں روٹی ملا کر دیجاتی تو میں پہلے روٹی الگ کر کے سارا قیمہ چٹ کر جاتا اس کے بعد روٹی کے ان ٹکڑوں کی نوبت آتی جن میں قیمہ لگا ہوتا۔ کبھی کبھی نرم سی موٹی اور پھولی ہوئی روٹی ایسی کوئی چیز ملتی، وہ بھی بڑے مزے کی ہوتی۔ بس ایک بات مجھے بہت بری لگتی۔ کھانا پلیٹ میں ڈالا جاتا، دودھ دیا جاتا یا وہ سخت سا بسکٹ جسے توڑنے کے لیے مجھے دانتوں سے زور لگانا پڑتا تو کوئی یہ نہیں سوچتا تھا کہ شاید مجھے بہت بھوک لگ رہی ہو۔ مجھے تھوڑی دور پر کھڑے یا بیٹھ لیٹ کر انتظار کرنا پڑتا۔ میں کبھی پلیٹ کی طرف دیکھتا اور کبھی کھانا دینے والے کے ہاتھوں کی طرف۔ پھر ہاتھ کی دو انگلیاں ملتیں اور جیسے ہی چٹکی بجتی میں کھانے پر ٹوٹ پڑتا۔ کبھی کبھی مالکن مجھے نلی دیتی جس کے موٹے والے حصہ پر گوشت لگا ہوتا، پہلے تو میں گوشت چٹ کر جاتا اس کے بعد نلی کو دانتوں سے دبا کر توڑ ڈالتا اور اس کے اندر کا گودا چاٹ ڈالتا۔ ہڈی کی باری اس کے بعد آتی۔ یہ گودا تو قیمہ سے بھی زیادہ مزیدار ہوتا۔ ہڈی ختم کرنے کے بعد بھی گودے کا مزہ یاد کر کے میں بہت دیر تک ہونٹوں پر زبان پھیرا کرتا۔

ڈرتا میں سب سے زیادہ مالک سے تھا اور اس کی آنکھ کا ایک ایک اشارہ بھی سمجھتا تھا لیکن جب سفید بالوں والا موجود ہوتا تو میں مالک سے میں ذرا کم ڈرتا۔ وہ کہتا " کانگ گو" تو میں بڑے مالک کی طرف دیکھتا اور اپنی جگہ گردن جھکائے کھڑا رہتا لیکن اپنے مالک سے آنکھیں ملانے کی ہمت مجھے اس وقت بھی نہ ہوتی۔

"اس وقت نہیں جائیں گے" زرین کہتی۔" دیکھ نہیں رہے ہیں ابو بیٹھے ہیں"۔ یہ سن کر میں دو قدم اور آگے بڑھ جاتا۔ سر جھکائے جھکائے۔ سفید بالوں والا ہی سخت سا بسکٹ جیب سے نکال کر میرے سامنے پلیٹ یا کاغذ پر رکھ دیتا اور فوراً ہی چٹکی بجا دیتا۔ مجھے اس کی یہ بات بہت پسند تھی۔ دوسرے کتوں کو نالیوں کے کنارے درختوں کے نیچے اور سڑک پر پڑی ہوئی چیزوں کو کھاتے ہوئے دیکھتا تو مجھے بہت برا لگتا۔ معلوم نہیں ان کے مالک انہیں ٹوکتے نہیں تھے یا وہ ان کا کہنا نہیں مانتے تھے۔ شروع میں تو میں بھی ہر جگہ منہ مار دیتا تھا لیکن سمجھانے اور ایک آدھ بار کی ڈانٹ یا مار کے بعد میری یہ عادت چھوٹ گئی تھی۔ میں اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ تھوڑا تھوڑا مجھے غرور ہو گیا تھا اور میرے گھر کے لوگ! وہ تو تھے ہی سب سے اچھے اور ان کی ہر چیز سب سے اچھی۔

وہ مکان جس کی دیوار میرے گھر سے ملی ہوئی تھی بہت بڑا تھا اور اونچا بھی۔ آس پاس اور بھی بہت سے چمکدار مکان تھے جن میں رہنے والے خوب اچھے کپڑے پہنتے تھے لیکن مجھے نہ اپنے گھر سے زیادہ کوئی مکان پسند تھا نہ اپنے لوگوں سے زیادہ کوئی دوسرا۔ پاس والے گھر میں دو دو گاڑیاں تھیں ان میں سے ایک بہت بڑی تھی اور دوسری ذرا چھوٹی۔ ایک رات میں اپنے مالک کے ساتھ ٹہلنے کے بعد لوٹ رہا تھا کہ ایک گاڑی آکر اسی مکان پر رکی۔ اس کی روشنی سیدھی میری آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ مجھے بہت برا لگا۔ گھر آکر میں مالک کی

اسکوٹر کے پاس جاکر پچھلی گدّی پر پیر رکھ کر کھڑا ہو گیا اور میں نے اپنا منھ اس پر ٹکا دیا۔ میرے مالک کی یہ چھوٹی سی گاڑی بھی بہت تیز دوڑتی تھی۔ اس گاڑی کا اُس سے کیا مقابلہ؟ اور پھر اس کے چلنے کی تو آواز بھی ہوتی تھی جو میں پہچانتا تھا۔ ایسی تھوڑی تھی کہ پاس سے نکل گئی اور پتہ بھی نہ چلا۔ میرا مالک اس پر بیٹھ کر کہیں جاتا تھا۔ ایک دن میرے مالک نے اسکوٹر باہر ہی کھڑی رہنے دی اور گیٹ کھول کر مجھے باہر بلایا۔ دھیرے دھیرے میرا سر سہلایا اور کہا "اسٹے ہیئر" میں سمجھا نہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف بڑھا تو اس نے رک کر اسکوٹر پر ہاتھ رکھا اور بولا "اسٹے ہیئر۔ آئی ایم کمنگ جسٹ ناؤ" اب بات میری سمجھ میں آگئی اور میں اسی جگہ رکا رہا۔ میرے مالک کو گھر سے آنے میں کچھ دیر لگ گئی لیکن میں وہیں کھڑا رہا۔ اتنے میں کسی نے آکر گدّی پر ہاتھ رکھ دیا تو میں اپنے اگلے دونوں پیر اس کے کندھے پر ٹکا کر زور زور سے بھونکنے لگا۔ وہ بھاگا تو میں نے بھونکتے بھونکتے اس کا پیچھا کیا لیکن پلٹ پلٹ کر اسکوٹر بھی دیکھتا رہا اس لیے وہ جانے کہاں چھپ گیا۔ میری آواز سن کر مالک دوڑا دوڑا گھر کے اندر سے آیا تو میں گدّی پر پیر رکھے کھڑا تھا "کیا ہوا کانگ"؟ اس نے کہا اور میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اتنے میں وہی آدمی جس کو میں نے دوڑایا تھا پارک کے موڑ سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں غرّایا تو میرے مالک نے مجھے چپکارا اور دونوں باتیں کرنے لگے۔

مجھے بڑی شرم آئی کہ میں اپنے مالک کے دوست کو بھی نہیں پہچانتا۔ وہ میرے مالک اور میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔

۷

برسات کے دن تھے۔ کل رات ہی میں نے سڑک پر جگہ جگہ پانی بھرے ہونے کے باوجود خوب اچھل پھاند کی تھی۔ لیکن اس وقت مجھے اپنا بدن بھاری بھاری لگ رہا تھا۔ روز کی طرح مجھے کھانا دیا گیا لیکن میں اپنی جگہ سے اٹھا تک نہیں۔ مالکن نے بہت کہا لیکن میں نے کھانے کو منہ بھی نہ لگایا۔ زرّین اپنا تھیلا لے کے جا چکی تھی۔ تھوڑی دیر میں میرا

مالک گھر سے نکلا تو اس کی نظر میری پلیٹ پر پڑی۔ "کانگ تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟
———— اس نے کہا اور میری پیٹھ سہلائی۔ پھر اس نے میرا منھ اونچا کر کے ناک دیکھی اور بولا "سوکھ رہی ہے" اور پھر میرے سر کو دھیرے دھیرے سہلاتے ہوئے کہا "ٹمپریچر ہے، ہلکا سا" اس کے بعد اس نے میری پیٹھ تھپتھپائی اور مجھے تسلی دی "شام کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے چلیں گے" میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا گیٹ تک اسے چھوڑنے گیا اس نے ایک بار پھر مجھے دیکھا اور چلا گیا۔

میں سارے دن برآمدے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ زرین اپنے وقت پر واپس آئی۔ میری پلیٹ کے کھانے میں چونٹیاں دیکھ کر اس نے سارا کھانا پھینک دیا اور دوسری صاف پلیٹ میں قیمہ دیا۔ میں نے سونگھا تک نہیں، پھر اس نے مونگ پھلی کے دانے دیے میں نے انھیں بھی بس سونگھ کر چھوڑ دیا۔ کچھ کھانے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ جب گھر کی مالکن نے کھانے کے لیے بار بار کہا تو میں نے منھ دوسری طرف کر لیا۔ شام کو واپس آتے ہی میرے مالک نے پیٹھ چھوئی اور "بخار تیز ہو گیا ہے" کہتا ہوا اندر چلا گیا۔ بس ذرا سی دیر میں باہر آیا اور رکشہ پر بٹھا کر مجھے ڈاکٹر کے یہاں لے گیا۔

ڈاکٹر صاحب کو میں جانتا تھا، میرا مالک اسے یہی کہتا تھا۔ تین چار بار تو وہ دو دو انجکشن لگا چکے تھے۔ تکلیف تو ہوئی تھی لیکن بہت زیادہ نہیں۔ وہ میری پیٹھ پر پیار سے ہاتھ بھی پھیرتے تھے اس لیے مجھے اچھے لگتے تھے۔ انھوں نے میز پر لٹا کر انجکشن لگایا میرے مالک نے میرا منھ پکڑ رکھا تھا۔ اس کی یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی۔ کیا میں ڈاکٹر صاحب کو کاٹ لیتا؟

اگلے دن میری طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا اور شام کو پارک میں خوب اُدھم چوکڑی مچائی۔ لیکن تین چار دن کے بعد مجھے پھر بخار آ گیا۔ پھر انجکشن لگایا گیا اور طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ لیکن یہ چوتھے پانچویں دن یا آٹھ دس دن بعد بخار آ جاتا۔ کبھی کبھی

تو بخار دو دو دن رہتا۔ میں بہت دبلا ہو گیا تھا۔ میری پیٹھ پر لوگ ہاتھ پھیرتے تو ان کی انگلیاں میری پسلیوں سے لگتیں۔ کمزور تو تھا لیکن میری ہمت میں کمی نہیں آئی تھی۔ چار پانچ دن کے بخار سے اٹھا تو اسی شام یا اگلی شام میں پارک میں دوڑ بھاگ کرتے کرتے ہمیشہ کی طرح اس جگہ کو دگیا جہاں اینٹوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ آگے کے داہنے پیر میں زور دار ٹیس اٹھی لیکن میں پی گیا اور دھیرے دھیرے چل کر اپنے مالک کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے میرے گلے کے پٹے میں "لیش" ڈالی۔ میں ان کے ساتھ چپ چاپ گھر آ کر اپنے گدے پر بیٹھ گیا۔

صبح پیشاب کرانے کے لیے گیٹ کھولا گیا تو میری وہی ٹانگ جس میں رات کو زوردار جھٹک ہوئی تھی خوب سوج گئی تھی اور مجھے بستر سے اٹھنے میں بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ میرا مالک مجھے فوراً ڈاکٹر کے یہاں لے گیا۔ انہوں نے ایک چھوٹی سی چمکدار ڈنڈی سے جس کے ایک کونے پر چکنا سا پتھر لگا ہوا تھا میری ٹانگ کو دھیرے دھیرے ٹھونکا۔ وہ کچھ کچھ پریشان معلوم ہو رہے تھے۔ انہوں نے میرے مالک سے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا لیکن مجھے دوبارہ رکشہ میں بٹھا کر بہت دور لے جایا گیا۔ اتنی دور کہ میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو پائیدان پر لیٹ گیا۔ آخر وہ مکان آیا جہاں مجھے لے جایا جا رہا تھا۔ میرے مالک نے ایک عورت سے کچھ بات کی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور تھوڑی دور جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہاں کئی کتے پہلے سے تھے۔ ان میں سے ایک کو دیکھ کر مجھے اپنی بیماری سے پہلے کے دن یاد آ گئے۔ خوب کسی ہوئی چمکدار جلد، چاروں ٹانگوں پر اوپر کی طرف گوشت ہی گوشت، چوڑا سینا اور دانتوں کی مضبوط پکڑ۔ اس وقت میری حالت دیکھ کر کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں کیسا تھا۔ پھر بھی مجھے یقین تھا کہ میرا مالک علاج کرا کے مجھے پہلے ہی جیسا کر دے گا لیکن اس کی پریشانی دیکھ کر میرا دل کڑھتا تھا پر میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

آخر مجھے ایک مشین کے سامنے کھڑا کیا گیا۔ خوب تیز روشنی ہوئی اور مجھے میز پر سے

آتار لیا گیا۔ میرے مالک نے اپنی جیب سے بہت سے روپے نکال کر اس عورت کو دیے۔ مجھے اپنے مالک پر بہت رحم آیا اور اس عورت پر غصہ۔

دو تین دن بعد میں پھر ڈاکٹر صاحب کی میز پر لیٹا ہوا تھا ایک گیلے اور چپچپے سے کپڑے کی پٹی میری اس ٹانگ پر جس میں زوروں کا درد تھا باندھ دی گئی، اوپر سے نیچے تک۔ مجھے بہت برا لگ رہا تھا اور یہ ٹانگ بھاری بھاری بھی لگ رہی تھی۔ گھر آ کر میں نے تھوڑا سا کھانا کھایا اور سو گیا اور بہت دیر تک سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو پٹی سوکھ گئی تھی ــــ میں نے اٹھنا چاہا ٹوٹی والی ٹانگ موڑ نہ سکا لیکن کسی نہ کسی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ دو تین دن تک تو اٹھنے اور چلنے پھرنے میں بہت پریشانی ہوئی۔ اس کے بعد میں تین ٹانگوں کے سہارے چلنے اور کبھی کبھی دوڑنے لگا۔ لیکن مجھے دوڑنے سے منع کیا جاتا تھا۔ میری خوراک تو کم ہو گئی تھی لیکن مجھے بخار نہ تھا اور ناک بھی گیلی تھی۔ کھانے کے علاوہ دونوں وقت دوا ڈال کر مجھے دودھ بھی دیا جاتا تھا جس سے بدن میں کچھ کچھ طاقت آنے لگی تھی لیکن کمزوری اب بھی بہت تھی۔ پہلے تو میں دن میں بس دو تین بار سوتا تھا لیکن اب سارے دن سوتا جاگتا رہتا۔ اونگھتے اونگھتے وہ دن یاد آ جاتے جب میں پارک میں دوڑتا پھرتا تھا اور بھینسوں کو دیکھ کر پاگل ہو جاتا تھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ بھینسیں میرے گھر کی جھاڑیوں کو تو اب بھی نہ چھوتیں اور سڑک پر سے تیز تیز چلتے ہوئے گذر جاتیں۔ شاید انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ میں ان پر جھپٹ پڑنا تو دور کی بات زوروں سے بھونک بھی نہ سکتا تھا۔

ایک دن جانے سب کو کیا ہوا کہ خوب اچھے اچھے کپڑے پہن کر کہیں چلے گئے اور مجھے گھر کے اندر کر دیا۔ میں پہلے تو دروازے کے پاس کان لگائے پیروں کی چاپ سنتا رہا لیکن جب باہر کے گیٹ میں تالا لگنے کی آواز آئی تو میں بدن کا سارا بوجھ تین ٹانگوں پر ڈالے لنگڑاتا ہوا لابی پار کر کے اپنے مالک کے کمرے کے دروازے کے پاس آ کر لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے میں نے سوچا کہ میں نے اپنی چھوٹی سی دم جو ذرا سی خوشی کی بات پر آپ ہی آپ ہلنے لگتی تھی، جانے کتنے

دن سے نہیں ہلائی۔ میں نے جھوٹ موٹ خوشی میں اسے ہلانے کی کوشش کی لیکن کچھ نہیں ہوا۔ سر گھما کر پیچھے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ پھر میں نے بائیں ٹانگ پر ذرا سا زور دے کر کروٹ لینے کی کوشش کی تو بھاری سر پر قابو نہ رہا اور دھپ سے فرش سے ٹکرا گیا۔ بہت تیز درد ہوا اور آنکھوں کے سامنے تھوڑی دیر تک اندھیرا سا چھایا رہا لیکن کیا کرتا۔ ویسے اس طرح کی تکلیفوں کا اب میں کچھ کچھ عادی ہو گیا تھا۔

پکا فرش پسلیوں میں چبھنے لگا تو میں نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی لیکن پلاسٹر کی وجہ سے دوسرا پیر مڑ نہ سکا اور میں ذرا ادھر ادھر ہو کر لیٹا رہا۔ لیٹے لیٹے شاید ایک جھپکی آ گئی۔ آنکھ کھلی تو لالی کے پیچھے دیوار پر کچھ کھٹ پٹ ہو رہی تھی۔ میں نے سونگھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو میں اسی طرح لیٹا رہا، چپ چاپ۔ تھوڑی دیر میں آوازیں آنا بند ہو گئیں یا مجھے جھپکی آ گئی، آنکھ کھلی تو زیادہ شور ہو رہا تھا لیکن سمجھ میں اب بھی کچھ نہ آیا۔ میں اسی طرح لیٹا ان دنوں کو یاد کرتا رہا، جب ذرا سی کھٹ پٹ ہونے پر میں دیوانہ ہو جاتا تھا اور گیٹ سے مکان کے پیچھے کی دیوار تک دوڑا دوڑا پھرتا اور بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیتا تھا۔ اتنے میں چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھڑکی کا پورا چوکھٹا پیچھے کی طرف جھک گیا اور ایک چھوٹے سے قد کا لڑکا لالی میں کودا۔ اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی اور اس نے بڑا دروازہ کھول دیا۔ اب ایک لمبا چوڑا آدمی جس کے ہاتھ میں لوہے کی ایک موٹی سی راڈ تھی، اندر آ گیا۔ لوہے کی یہ راڈ بیسرے ہی گھر کی تھی اس سے مزدور پیچھے کے کھیت میں زمین کھودتے تھے۔ اب چار آنکھوں نے ایک طرف سے اور دو آنکھوں نے دوسری طرف سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نہ میں کچھ بولا نہ وہ دونوں۔ میں نے سوچا کہ شاید مجھے دیکھ کر ہی وہ دونوں ڈر کے مارے بھاگ جائیں۔ لیکن وہ مجھ سے ذرا نہ ڈرے۔ ہو سکتا ہے انہیں میری حالت کے بارے میں پہلے سے معلوم رہا ہو۔

وہ دونوں ڈرائنگ روم کی طرف بڑھے اور ان کی پیٹھ میری طرف ہوئی تو میں نے پہلے

بائیں ٹانگ پر زور دیا پھر دائیں ٹانگ پر جو موٹے سے سخت کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔ زور درد کی چمک ہوئی جس سے میرے منھ سے ہلکی سی "سی" کی آواز نکل گئی لیکن میں برداشت کر گیا اور پچھلی دونوں اور اگلی بائیں ٹانگ پر سارے بدن کا بوجھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ ایک بار سارے بدن کو ذرا سا پیچھے کر کے اپنی طاقت آنکنے کی کوشش کی۔ اس وقت وہ دونوں کچن سے نکل کر اس کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے جس میں سفید بالوں والا رہتا تھا اور گھر کی مالکن بھی۔ میں ساری ہمت اکٹھی کر کے تخت اور پھر بڑی سی میز کے پاس آ گیا۔ میں نے پھر ایک بار اپنی طاقت کو تولا۔ وزن بہت کم تھا لیکن دل کی طاقت نے پلڑا بھاری کر دیا۔ وہ لوگ کمرے میں داخل ہی ہونے والے تھے۔ میں نے اپنے مالک اور گھر کے سارے لوگوں کو یاد کیا اور ساری طاقت پچھلی ٹانگوں کے پٹھوں میں بھر کر ایک جست لگا دی۔ سوچا تو یہ تھا کم سے کم چھوٹے والے کی گدّی تک تو پہونچ ہی جاؤں گا لیکن اس کی کمر تک پہونچتے پہونچتے ہی ہمت اور طاقت دونوں نے ساتھ چھوڑ دیا اور میں بھد سے پکّے فرش پر گر پڑا۔

میرے گرنے کی آواز سن کر لمبے والے نے پلٹ کر دیکھا اور مڑ کر اسی لوہے کی راڈ سے میرے پیٹ کے ذرا اوپر دو وار کیے۔ درد کی ایک لہر اور پھر ایک سلاخ سی پورے بدن میں بجلی کی سی تیزی سے دوڑ گئی۔ میں بھونک بھی نہ سکا۔ پھر جب دونوں آنکھوں سے اوجھل ہو گئے اور کمرے کے اندر سے آنے والی "کھٹ کھٹ" کی آوازیں میرے کانوں سے ٹکرانے لگیں تو میں بڑی مشکل سے اُٹھا اور تین ٹانگوں پر دھیرے دھیرے چلتا ہوا پہلے والی جگہ پر آ کر لیٹ گیا۔ مجھ پر غشی سی طاری ہو گئی تھی لیکن ایسی بھی نہیں کہ اندازہ نہ کر سکوں کہ کمرے میں کچھ گڑبڑ ہو رہا ہے۔ اگلی داہنی ٹانگ کا درد، پکّی زمین پر ٹکرانے سے پسلیوں کی چبھن اور کولھے کی چوٹ ہی کیا کم تھی کہ انہیں آتا جاتا دیکھ کر آنکھوں سے بھی تکلیف کو اپنے جسم میں داخل ہونے دیتا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

میں کتنی دیر تک غافل رہا یا سوتا جاگتا رہا کچھ بھی نہیں معلوم لیکن جب آنکھ کھلی

تو وہ دونوں بھاگ رہے تھے۔ چھوٹے والے کے بارے میں تو نہیں معلوم لیکن لمبے والے کی بغل میں ایک پوٹلی دبی ہوئی تھی۔ میں اپنے آپ کو ہلا بھی نہ سکا لیکن آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا جب میں اپنے گھر کی جھاڑیوں سے کس کس کے اپنے موٹے سے پیٹ کو رگڑتی ہوئی بھینس کی دم سے لٹک گیا تھا اور پھر ریل کی پٹری کے پاس اس کی دُم چھوڑ کر خون کا پورا مزا لینے کے لیے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے گھر لوٹ آیا تھا۔

ابھی خون کے مزے کی یاد پوری طرح سے زبان سے غائب بھی نہ ہوئی تھی کہ میری نظر زرّیں پر پڑی اور پھر گھر کی مالکن پر۔ دونوں کو گھبرائے گھبرائے اِدھر اُدھر آتے جاتے، پاس پڑوس کے لوگوں کے سوالوں اور زرّیں کو سسکیاں لے لے کر روتے ہوئے دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ کچھ گڑبڑ ہو گیا ہے، لیکن کیا گڑبڑ ہوا ہے یہ مجھے ٹھیک سے معلوم نہ تھا۔ وہ لوگ کیا باتیں کر رہے تھے یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایسا تو میرے گھر میں ہوتا نہیں تھا اس دن اور کیا کیا ہوا یہ تو یاد نہیں لیکن کئی دنوں تک دو تین نئے لفظ۔ چور۔ چوری۔ اور پولیس بار بار سنائی دیتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد جب میں نے اپنے مالک کے جوتوں کی آواز سنی تو کنکھیوں سے اسکی طرف دیکھا۔ "اسی دن کے لیے تو پالا تھا اور تم بیمار پڑ گئے کانگ!" اس نے کہا۔

میں نے شرم کے مارے منھ دوسری طرف کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے مالک سے آنکھیں ملانے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ اسی وقت پیٹ کے پاس سے ایک ٹیس سی اٹھی اور میرے بدن کی ایک ایک بوٹی جیسے کانپ گئی۔ اتنے میں کچھ اور جانے پہچانے لوگ گھر میں آئے اور اسی طرح کی باتیں ہونے لگیں جو میں بہت دیر سے سن رہا تھا۔ کسی نے کہا "کوئی ایسا ضرور تھا جسے سب معلوم تھا، یہ بھی کہ کانگ بیمار ہے۔"

اپنی بیماری کا ذکر سن کر مجھے اپنے اوپر بہت غصہ آیا۔ ایسی زندگی سے فائدہ کہ اپنے مالک کے کام نہ آسکوں۔ میں کسی سے آنکھیں نہ ملاتا۔ بڑی شرم آتی۔

اسی طرح دو تین دن گذر گئے۔ دھیرے دھیرے سب کچھ پہلے کی طرح ہوتا جا رہا تھا۔
ایک شام سفید بالوں والا آہستہ آہستہ میری پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہا تھا جب اس کی انگلیاں اس جگہ پہونچیں جہاں مجھے لوہے کی راڈ سے مارا گیا تھا تو زوروں کی چمک ہوئی، میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اسی جگہ پھر ہاتھ پھیرا اور زرّین کو پکارا "زرّین بیٹی یہاں آؤ۔ دیکھو تو یہ کیا ہے؟"

تھوڑی دیر بعد زرّین اور گھر کی مالکن اس جگہ کو دھیرے دھیرے چھو رہے تھے میں اپنی تکلیف ظاہر نہیں ہونے دے رہا تھا اس لیے وہ لوگ پریشان تو تھے لیکن زیادہ نہیں۔ ان کے ہاتھ پھیرنے سے مجھے بھی محسوس ہوا کہ پیٹ کے اوپر کچھ ابھرا ابھرا سا ہے۔ اتنے میں میرا مالک آ گیا اور اس نے کوئی گیلی گیلی چیز روئی سے اس جگہ لگا دی۔

رات بہت بےچینی سے گذری۔ ویسے تو سوتا میں دن ہی تھا اور رات کے وقت تو میں جھاڑیوں، لوہے کے گیٹ، درختوں والے پتلے راستے اور پیچھے کے آنگن کے بس چکر لگایا کرتا تھا۔ تھک جاتا تو گیٹ کے پاس اس طرح بیٹھ جاتا کہ جھاڑیوں کے پاس والی دیوار سے گھر کے پیچھے تک کی دیوار دیکھ سکوں ـــــ جاگتے رہنے کی اس عادت کی وجہ سے رات کاٹنا مشکل ہو گئی۔ لیکن صبح ہوتے ہوتے مجھے معمولی سی جھپکی آ گئی۔ اتنے میں میرے مالک نے پیٹھ پر اسی جگہ دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرا تو میری آنکھ کھل گئی۔

۸

ڈاکٹر صاحب نے جیسے ہی اپنی میز پر لٹا کر اس جگہ ہاتھ پھیرا۔ وہ میرے مالک کی طرف منہ کر کے بولے "میں کہتا نہ تھا کہ کالنگ نے حملہ ضرور کیا ہوگا۔ چوروں نے کسی سخت چیز سے مارا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کی یہ بات سن کر بہت دنوں بعد میری آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور میں نے اپنے مالک سے آنکھیں ملائیں۔ وہ محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت

ڈاکٹر نے کچھ اور کہا جس سے وہ پریشان سا ہو گیا لیکن میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

اپنے مالک کے پیار بھرے اشارے پر میں ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ یہ ہاتھ بدن پر رکھے ہوئے ہوں تو پھر کیا پریشانی۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب لمبی لیکن پتلی سی سوئی پیٹ میں گھونپ دیں گے۔ یہ تو وہ کئی بار کر چکے ہیں، مجھے ذرا بھی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے الماری سے دو تین شیشیاں، سوئیاں، دو ایک لمبی لمبی چاقو ایسی چیزیں اور رسّی کی ایک جالی نکالی۔ اسے دیکھ کر میرے مالک نے کہا۔

" ڈاکٹر صاحب اس کی کیا ضرورت، میں منھ پکڑے لیتا ہوں۔"

" نہیں منھ پہ جالی ضرور باندھ دیجئے۔ مانا بہت کمزور ہو گیا لیکن ہے تو ڈوبرمین۔ پلٹ پڑا تو ہاتھ چبا ڈالے گا۔" انھوں نے کہا۔

" ڈوبرمین" ۔۔۔ یہ نام تو میں نے کئی بار سنا تھا لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے یہ معنی بھی ہوتے ہیں۔

جالی سے میرا منھ باندھ دیا گیا۔ میرے مالک نے ذرا زور دے کر ایک ہاتھ سے میرا سر داب لیا اور دوسرے ہاتھ سے پیٹ۔ میز پر کچھ کھڑپڑ ہوتی رہی ۔۔۔ پھر ایک دم مجھے لگا کہ اس جگہ کو جو ابھر آئی تھی جیسے چاقو سے کاٹا جا رہا ہو۔ درد کی ایک بہت تیز لہر بدن میں چاروں طرف پھیل گئی لیکن جب سر کے پاس پہونچی تو میں برداشت نہ کر سکا۔ میں نے غصّہ سے منھ ڈاکٹر صاحب کی طرف بڑھایا۔ وہ ہڑبڑا کر پیچھے ہٹ گئے تو مالک نے مجھے چمکارا تو میں نے دانت اندر کر لیے اور طے کر لیا کہ کچھ ہو جائے اب سر نہ اٹھاؤں گا۔ میں نے منھ بھی سختی سے بند کر لیا۔

کھال کئی بار کاٹی گئی۔ اندر سے بدبودار پانی چھل چھل بہنے لگا۔ طرح طرح کی دوائیں کاٹی ہوئی جگہ میں بدن کے اندر لگائی گئیں۔ اس کے بعد میری کھال کو سی دیا گیا۔ سوئی جب جب اندر جاتی بدن کا رواں رواں کانپ جاتا لیکن میں دل ہی دل میں اپنے مالک

سے پکا وعدہ کر چکا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے اپنے منھ سے آواز نہ نکلنے دوں گا۔ یہی میں نے کیا۔

تھوڑے دنوں بعد میرا زخم بھرنے لگا۔ پھر پیروں کی پٹی بھی کاٹ دی گئی۔ مجھے بڑا اچھا لگا۔ اب میں دھیرے دھیرے چلنے پھرنے لگا تھا۔ بدن میں تھوڑی تھوڑی طاقت بھی آگئی تھی۔

کئی دنوں بعد مجھے خوب مل مل کے نہلایا گیا۔ میرے بال چمک اٹھے۔ اور میری آنکھوں میں بیماری سے پہلے کے دنوں کی یادیں ابھرنے لگیں۔ میں تو پارک میں دوڑ بھی لگانا چاہتا تھا لیکن اس کی اجازت نہ تھی۔ اب میں آس پاس کے مکانوں اور ان کے رہنے والوں کو جنہیں بیماری کے دنوں میں بھول سا گیا تھا دوبارہ کچھ کچھ پہچاننے لگا تھا۔ ایک دن پارک کے دوسری طرف کے کونے پر "گولو" دکھائی دیا۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی آڑ میں ہو گیا۔ اچھا ہی ہوا۔ اسے میری بیماری کے بارے میں معلوم نہ ہوگا نہیں تو حملہ ضرور کر دیتا اور میرا سارا بھرم ٹوٹ جاتا۔ کیسی شرمندگی ہوتی۔

۹

رات بھر جاگتی آنکھوں سے سہانے خواب دیکھتا رہا لیکن صبح ذرا سی جھپکی لے کر اٹھا تو بدن بھاری تھا۔ میرا مالک کہیں جانے کے لیے باہر آیا تو بس ایسا بن کے بیٹھ گیا جیسے بالکل ٹھیک ہوں۔ جانے کہاں جا رہا ہے۔ اسے پریشان کیوں کروں۔ شاید جلدی میں تھا اس نے میرے سر پر دھیرے دھیرے گدگدی کی اور چلا گیا۔ اسے خوش دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگا۔ میں اس کے پیروں کی چاپ سنتا رہا اور جب یہ آواز غائب ہو گئی میں اسی جگہ لیٹ گیا۔

طبیعت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ تکلیف کسی ایک جگہ نہ تھی۔ بدن میں درد کبھی ایک جگہ ہوتا کبھی دوسری جگہ۔ ایسا درد پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ مجھ سے نہ دن میں کھانا کھایا گیا نہ شام کو۔

زرّین نے بہت چمکارا۔ کھانے کے لیے بار بار کہا لیکن میرا ذرا بھی جی نہ ہوا۔ رات میں جب میرا مالک آیا اور اسے معلوم ہوا کہ میں نے سارے دن کچھ نہیں کھایا ہے تو وہ آکر میرے پاس بیٹھ گیا۔ انہی کپڑوں میں جو صبح پہن کر گیا تھا۔ مجھے اپنے اوپر بڑا غصہ آیا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ گھر لوٹا تو اب میری وجہ سے پریشانی میں پڑ گیا۔ وہ میری پیٹھ سہلانے لگا تو میں نے اس کے دل کا بوجھ کم کرنے کے لیے جھوٹ موٹ بھونکنے کی کوشش کی۔ آواز جیسے گلے میں پھنس کے رہ گئی۔ لیکن میں نے اپنی تکلیف اس پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ وہ کچھ مطمئن ہو گیا۔ اور میری چمکدار پلیٹ میں قیمہ اور وہ پھولی پھولی روٹی لے آیا جو مجھے پسند تھی۔ میں اسی طرح لیٹا رہا۔ لیکن جب اس نے کئی بار پیار سے 'کھا لو کانگ' کھا لو کانگ' کہا تو میں نے سوچا کہ اس کا دل رکھنے کے لیے جیسے بھی بن پڑے ایک دو نوالے تو کھا ہی لوں۔ میں نے ذرا سا قیمہ چکھا ہی تھا کہ جانے کیسے پورا منہ پانی سے بھر گیا۔ اور میں نے پلیٹ ہی میں قے کر دی۔

اگلی صبح پھر مجھے ڈاکٹر صاحب کے پاس لے جایا گیا۔ انہوں نے میری پیٹھ، پیٹ، ٹانگوں اور گردن کو دبا دبا کر دیکھا۔ وہ کچھ کچھ پریشان معلوم ہو رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے میری ٹانگ اور پیٹ کے بیچ میں شیشے کی ایک تیلی سی نلکی لگا دی۔ یہ پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ میں خاموش لیٹا رہا۔ تھوڑی دیر بعد نلکی نکال کر انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے کر دی۔ یہ بھی کوئی نئی بات نہ تھی۔ لیکن جب انہوں نے وہ نلکی اسی طرح میرے مالک کی آنکھوں کے سامنے کی تو میں نے سوچا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے میرے پیٹ میں سوئی لگا دی۔ تکلیف تو ہوئی لیکن کوئی خاص نہیں یہ تو کئی بار ہو چکا تھا۔ لیکن دوسری سوئی جب پیچھے کی بائیں ٹانگ میں لگائی گئی میری جان ہی نکل گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے گاڑھا گاڑھا گرم پانی دھیرے دھیرے اوپر چڑھ رہا ہے۔ جہاں جہاں وہ پانی پہنچتا اسی ٹیس اٹھتی کہ برداشت کرنا مشکل ہو جاتا۔ لیکن میرے مالک کے ہاتھ نے جو میری پیٹھ پر رکھا ہوا تھا بڑا سہارا دیا۔

اس سوئی کے بعد تو میرے لیے وہ پیر زمین پر رکھنا مشکل ہو گیا تھا لیکن مجھے بار بار پیشاب لگتا تھا اور باہر جانا پڑتا تھا۔ بڑی تکلیف ہوتی۔ اس پیر کا پنجہ زمین سے چھو بھی جاتا تو ایسی تیز چمک اٹھتی کہ جی چاہتا وہیں لیٹ جاؤں لیکن یہ سوچ کر کہ محلّے کے کسی کتّے نے مجھے سڑک پر لیٹا دیکھ لیا تو کیا سوچے گا کسی نہ کسی طرح سڑک کے اس پار پیشاب کرنے کی کوشش کرتا۔ پیشاب تو نہ ہوتا بس دو ایک قطرے ٹپکتے۔ میں اپنے مالک کو دیکھتا تو کٹ کٹ کے رہ جاتا اور مجھے اپنی بیماری سے گھن آنے لگتی۔ آخر اسے کتنی تکلیف دوں، اور پھر مجھے دیکھ کر اس کے چہرے اور آنکھوں میں جو پریشانی دکھائی دیتی اسے برداشت کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ میں اپنا منہ دوسری طرف کر لیتا۔

میں نے اپنے مالک کو کئی دنوں سے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ سفید بالوں والا جب گھر سے باہر جانے لگتا تو گیٹ کے پاس سے واپس آکر ایک بار پھر میرے پاس کھڑا ہو جاتا۔ شام کو گیٹ کھولتے ہی وہ بس ایک سوال کرتا "کانگ کیسا ہے؟"۔ جواب تو کوئی نہ کوئی ضرور دیتا لیکن ہنستے ہوئے میں نے تین چار دن سے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔

اب میرے لیے بستر سے اٹھنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ لیکن میرے مالک نے جب رات میں کہا "کانگ باہر چلوگے؟" تو میرا دل مچل گیا، سامنے والا پارک دیکھنے کے لیے۔ ان کتّوں کو دیکھنے کے لیے جو مجھے دیکھ کر کونوں میں دبک جاتے تھے۔ ان کتیوں پر ایک نظر ڈالنے کے لیے جو میرے انتظار میں کھڑی رہتی تھی۔ اب تو یہ موٹا گدّا بھی جو تھوڑے ہی دن پہلے میرے لیے بنایا گیا تھا بدن میں چبھنے لگا تھا۔ اس پر جب میں پہلی بار لیٹا تھا تو مجھے کتنا اچھا لگا تھا۔ خود اپنا آپ بھی ــــــ اسی یاد کے سہارے میں نے بدن کی ساری طاقت تینوں ٹانگوں میں بھری اور دھیرے دھیرے اٹھ کھڑا ہوا، اور مالک کے ساتھ لنگڑاتا لنگڑاتا پارک کے پاس جا کر رک گیا۔ رک کیا گیا۔ بدن نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ جانے کیسے، میں جو بھی سوچتا، جو بھی چاہتا میرے مالک کو اس کا پتہ لگ جاتا۔ اس نے ایک بار بھی آگے بڑھنے

کو نہیں کہا اور میری پیٹھ سہلاتا رہا۔ میں نے منھ اٹھا کر جو کچھ بھی دیکھ سکتا تھا خوب اچھی طرح دیکھا۔ اس کے بعد اپنے گھر کیسے آیا، کیا سوچا، کچھ بھی یاد نہیں۔ پھر رات ہو گئی۔ بڑی لمبی رات کے بعد صبح ہوئی اور سورج کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی۔

پہلے پیٹ کے پاس جہاں چوٹ تھی وہاں درد ہوتا تھا۔ پھر پیر میں جیسے ہر وقت سوئیاں چبھتی رہتی تھیں اور اب تو سارا بدن ــ بس کیا بتاؤں کیا ہو رہا تھا۔ پیٹ میں جانے کیا اِدھر سے اُدھر چکّر لگایا کرتا۔

یہ سب اسی ڈاکٹر کا کیا ہوا ہے۔ میں سوچتا۔ لیکن میرا مالک مجھے پھر اسی کے پاس لے گیا اس نے میری آنکھوں کے اوپر اور نیچے کی کھال کھینچ کھینچ کر بار بار دیکھا۔ میرا منھ کھلوا کر زبان دیکھی۔ لیکن نہ سوئی لگائی نہ کوئی دوا لگائی۔ یہ بات مجھے اچھّی لگی۔ اس نے میرے مالک سے کہا "شام کے وقت کانگ کو نہ لائیے گا، بس مجھے حال بتا دیجئے گا۔"

شام اترنے لگی تو میں نے دل ہی دل میں کہا "چلو پہاڑ ایسا دن تو کٹا۔"

اس وقت میرا مالک ڈاکٹر صاحب کے یہاں ہی گیا ہوا تھا۔ گھر کے باقی سارے لوگ میرے پاس بیٹھے تھے۔ ہر ایک کے چہرے پر پریشانی اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ زرّیں تو رو رہی تھی۔ شاید دوسرے بھی رو رہے ہوں۔ مجھے صاف صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اتنے میں گیٹ کھلنے کی آواز ہوئی۔ میرا مالک اندر آیا۔ نیلا پینٹ اور نیلا کوٹ پہنے ہوئے۔ مجھے اس کے یہ کپڑے بہت اچھّے لگتے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا میرے سامنے کی لمبی سی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر "نو نو" کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مجھ سے اس کا رونا نہ دیکھا گیا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن کان بند کرنا میرے بس میں نہ تھا اسلیے بہت کچھ سنتا رہا۔ کبھی کبھی آنکھیں کھول کے اپنے مالک کو دیکھتا۔ اسی وقت سفید بالوں والے نے اسے چمٹا لیا، پیار کیا اور پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب نے کیا کہا" میرے مالک کی آواز بھی رندھ گئی تھی۔
"کہتے ہیں صبح تک پیشاب نہ ہو تو زہر دیدیجئے۔ آپ لوگوں کو معلوم نہیں کہ وہ کتنی تکلیف میں ہے۔ دوسرے کتے تو کاٹنے لگتے ہیں۔ ایسے صبر کا ڈوبر مین تو میں نے دیکھا نہیں۔" اس نے روتے روتے کہا۔

"ہم اپنے ہاتھ سے زہر نہ دے پائیں گے۔" سفید بالوں والے نے کہا۔
"ڈاکٹر صاحب کو کیسے معلوم ہوا کہ مجھے اتنی تکلیف ہے۔ میں نے حیرت سے سوچا۔
اور یہ سوچتے سوچتے میرے منھ سے کراہ نکل گئی۔ میں نے جلدی سے دانت بھینچ لیے۔
اس کے بعد کی یادیں دھندلا گئی ہیں۔ رات گئے تک سارے لوگ میرے پاس بیٹھے رہے۔ اس کے بعد بجلی بجھادی گئی۔ پھر بھی تھوڑی دیر کے بعد کوئی نہ کوئی آتا پاس بیٹھ کر میرے پیٹ اور سر پر ہاتھ پھیرتا۔ پھر مجھے شاید نیند آگئی یا کچھ پتہ نہیں کیا ہوا ـــ معلوم نہیں کب، جانے کیسے میرے منھ سے زوروں کی چیخ نکل گئی۔ اتنے میں بجلی جلی۔ یہ زرین تھی۔ اس نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ سفید بالوں والا آگیا۔
اس نے میرے کھلے ہوئے منھ کو آہستہ آہستہ بند کر دیا۔ پھر دھیرے دھیرے میری آنکھوں پر اس طرح ہاتھ پھیرا کہ دونوں پپوٹوں کے بیچ کی پتلی سی لکیر سے جو دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا وہ بھی غائب ہو گیا۔ آگے والی میری ایک ٹانگ جانے کیسے لیٹے لیٹے ہی اوپر اٹھ گئی تھی اس نے وہ ٹانگ بھی دھیرے دھیرے نیچی کر کے گدے پر رکھدی۔

میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن کچھ نہ ہوا۔ لوگوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ کوئی اب بھی میرے بدن پر ہاتھ پھیر رہا تھا لیکن اب ان میں اتنی گرمی نہیں تھی اور میں پہچان بھی نہیں پا رہا تھا کہ یہ ہاتھ کس کا ہے۔ اسی وقت میں نے کئی دنوں بلکہ شاید مہینوں بعد چڑیوں کی چہکار سنی صبح ہونے والی تھی۔ مجھے نہلائے

جانے کا وقت ۔ اس کے بعد مجھے بس اتنا یاد ہے وہ بھی کچھ کچھ کہ اسی گدے اور میری خوشبودار چادر کے ساتھ مجھے پیچھے کے کھیت میں لے جایا گیا اور دھیرے دھیرے ایک گڑھے میں اتار دیا گیا ۔

نہ میں نے کسی کے رونے کی آواز سنی نہ کسی کو روتے دیکھا لیکن میں جانتا ہوں وہ سب رو رہے تھے ۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں رو رہا تھا یا نہیں لیکن اتنا پیار کرنے والے لوگوں کو چھوڑتے وقت کون ہے جو اپنے آپکو رونے سے روک سکے ۔

۱۰

میں کانگ تھا۔ میں ڈوبرمین تھا ۔

لیکن میں چوروں کو چوری کرنے سے نہ روک سکا ۔

ہاں میں نے جان ضرور دے دی ۔

یہ آخری خیال تھا جو میرے دماغ یا بدن یا آس پاس کی ہوا یا مٹی کو چھوتا ہوا گذر گیا ـــــ اسکے بعد مجھے نہ اپنے ہونے کے بارے میں کچھ معلوم ہے نہ اپنے نہ ہونے کے بارے میں ۔

▪▪

نہ دھوپ نہ سایہ

ھر وہ ممکن طریقہ اپنانے کے بعد جس سے میرے خیال میں یہ نئی پریشانی اور الجھن دُور ہوسکتی تھی کچھ بھی حاصل نہ ہوا تو میں بستر پر سے یکایک اُٹھ بیٹھا، دونوں ہاتھوں میں اپنا سر لے کر اسے زور سے دبایا، کنپٹیوں کو دھیرے دھیرے سہلایا، آنکھیں بند کر کے ان پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرا، انگلیاں چٹخائیں ـــــ لیکن ایک بوجھ تھا جو گردن اور سینہ کے درمیان اب بھی معلق تھا اور کھسکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

شام سے دو پیالی چائے چڑھا چکا تھا، اخبار کی وہ خبریں پڑھنے کی کوشش کی تھی جن کی حیثیت خبر سے زیادہ چٹکلے کی ہوتی ہے، ایک ماہنامے کے سارے افسانوں کے ایک ایک دو دو پیراگراف بھی پڑھ ڈالے تھے، لیکن بے سُود۔ اور عجیب بات یہ تھی کہ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس الجھن کا سبب کیا ہے۔ کوئی نیا مسئلہ یکایک سامنے آیا تھا نہ کوئی پریشانی۔ زندگی حسب دستور اپنے ڈھب پر چل رہی تھی ـــــ مکان کا ٹیکس کئی سال کا باقی تھا، بجلی کا بل چھ مہینے سے ادا نہیں ہوا تھا۔ چادر تو بڑھ نہیں سکتی تھی لیکن زندگی کے مطالبات میں دستور کے مطابق اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ زندگی کی مانگیں وسائل کی چادر کی لمبائی چوڑائی ناپنے لگیں تو سارا کام کاج ہی نہ ٹھپ ہو جائے۔ ہاں میں بھول گیا، پانی کا ٹیکس بھی ڈھائی برس کا باقی تھا، لیکن اس میں ایسی پریشانی کی کیا بات تھی؟ ساری زندگی ہی اسی طرح

گزری تھی ۔ نہ کسی دوسرے نے ایک اور چادر فراہم کرنے کے لیے ہاتھ اور پاؤں ہلائے تھے نہ یہ سوچا تھا کہ ہزاروں نہیں لاکھوں سے بہتر ہیں ۔ ان سے اچھا کھاتے ہیں، ان سے اچھا پہنتے ہیں ۔

لیکن یہ بھی کوئی نئی بات نہ تھی ۔ ایک دو نہیں پچیس تیس سال تک سوچنے کا انداز بدلنے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہنے کے بعد ہاتھ پاؤں ڈال دیے تھے ۔ یہ بھی خاصی پرانی بات ہے ۔ پھر یکایک ایسا کیا ہو گیا کہ خواہ مخواہ کی یہ بے نام الجھن کسی طرح دور ہی نہیں ہو رہی تھی ۔

یکایک ایک خیال دماغ میں کوندے کی طرح لپکا ۔ چپل پیر میں ڈالی اور "ابھی آتا ہوں" کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ سڑک پر ایک ایسی جگہ جہاں خاصا اندھیرا تھا، کھڑے ہو کر کچھ دیر سوچتا رہا کہ کیا کروں ۔ کہاں جاؤں ۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو یونہی ایک طرف چل دیا ۔ تراہے پر ایک دکان کے پاس رک کر سامنے کی دو سڑکوں کو جو دوسری سڑکوں کی طرح جانے کہاں کہاں جاتی تھیں دیکھتا رہا لیکن ان میں سے کسی میں کچھ بھی تو ایسا نہ تھا جو دوسری سے بہتر ہو ۔ یکایک جانے کیسے وہ پارک یاد آ گیا جو اس جگہ سے بمشکل دو فرلانگ دور ہو گا ۔ میں نے سر کو ایک معمولی سی جنبش دی، گویا خود سے کہہ رہا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہو گا کہ یہ نامعلوم سی الجھن دُور نہ ہو گی، اور دونوں طرف کی دکانوں کو کچھ سوچے سمجھے بغیر خالی خالی نظروں سے دیکھتا ہوا قدم بڑھانے لگا ۔

پارک میں سناٹے سے ایک کونے میں اسی بنچ پر بیٹھ گیا جو کبھی مجھے بے حد پسند تھی میں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر، جہاں تک ان کی پہنچ ممکن تھی، اسے ٹٹولا، یہ جاننے کے لیے کہ اسے بھی وہ نوجوان یاد ہے یا نہیں جو برسوں پہلے اس پر یونہی، کسی خاص سبب کے بغیر، پیار سے ہاتھ پھیرا کرتا تھا ۔ اجنبیت مکمل نہ تھی، یا شاید میرے حالات نے مجھے اس طرح سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور میں نے محسوس کیا جیسے دل کا بوجھ کچھ کم ہو گیا ہو ۔

یہ جگہ اب بھی پُر فضا تھی، بھینی بھینی خوشبو فضا میں بسی ہوئی تھی ۔ جھاڑیوں

کو مختلف جانوروں اور پرندوں کی شکل میں تراش دیے جانے کی وجہ سے فطرت سے قربت کا احساس تو کم ہو گیا تھا لیکن اب بھی بہت کچھ ایسا تھا جس پر نظریں ٹک جاتی تھیں۔

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ رات اب پوری طرح اُتر آئی تھی اور دور دور کھمبے پر لگے ہوئے بلب کی روشنی اور اندھیرے نے مل جُل کر درمیان میں ایسے حلقے بنا دیے تھے جنھیں نہ روشن کہا جا سکتا تھا نہ تاریک۔ یہی حلقے میری توجّہ کا مرکز بن گئے۔ روشنی اور تاریکی جو ایک دوسری کی ضد ہیں، کتنی آسانی سے گھُل مل جاتی ہیں۔ کتنی بہت سی چیزیں جو بالکل مختلف معلوم ہوتی ہیں، میں نے سوچا، کتنی آسانی سے ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو جاتی ہیں اور وہ جن میں سب کچھ نہ ہی تو بہت کچھ ایک سا ہے، بس کچھ نہ کہیے، برسہا برس ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ زندگی گذارنے کے باوجود اجنبی بنے رہتے ہیں۔

اسی وقت ایک نوجوان جوڑا، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے، اپنے آپ میں گم، پاس سے گذرا تو یادوں کے کئی چراغ جل اُٹھے، محرومیوں کا احساس بھی، لیکن ان دونوں کو جو میری بنچ کے بالکل پاس سے گزرے تھے، نہ میرے وجود کا احساس ہوا، نہ ان یادوں کے چراغوں کا، نہ ان محرومیوں کا جن کی دھوپ چھاؤں نے مجھے ذرا سی دیر کے لیے جیسے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

"یہی ہے زندگی"۔ میں نے فلسفی بننے کی کوشش کی۔ لیکن ماحول کی تبدیلی، پھولوں کی خوشبو اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے سپر ڈالنے سے انکار کر دیا اور حقیقت کو اپنی پسند کا لبادہ اڑھانے کی میری کوشش ناکام ہو گئی۔ پھر بھی میں آسانی سے ہار ماننے والا نہ تھا۔ اپنی زندگی کی کتاب کھول بیٹھا۔ ابھی دو ہی چار صفحے پلٹے تھے کہ جی اوب گیا۔ ایک ایک سطر پر کامیابیوں کے خواب تھے اور متضاد حقیقتیں، چند ایسی کہ اپنے آپ پر ترس کھانے کو جی چاہتا تھا۔ ویسے اپنے آپ کو دھوکا دینے کا اس سے آسان طریقہ اور کیا ہے کہ اُمید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ ابھی میں اسی ادھیڑبُن میں ہی لگا تھا کہ بنچ کے دوسرے سرے

پر دوہرے بدن کا ایک شخص دھپ سے بیٹھ گیا۔
بیٹھا کیا تقریباً نیم دراز ہو گیا۔
خیالات کا سلسلہ ٹوٹا

خیالات کا سلسلہ ٹوٹا تو یکایک احساس ہوا کہ اب پارک پہلے جیسا صاف ستھرا نہیں ہے اور ہوا میں ایک عجیب بو بھی شامل ہو گئی ہے جسے کسی طرح خوشگوار نہیں کہا جا سکتا۔

"پہلے اتنے لوگ کہاں آتے تھے؟" میں نے چاروں طرف نظریں گھمائیں اور سوچا "لیکن اب تو خاصی بھیڑ ہے۔ ظاہر ہے ان کے جسم کی گرمی، سانسوں اور پسینہ کا کچھ نہ کچھ اثر تو ہوگا ہی۔" میں نے احساس کی اس تبدیلی کے لیے بہانے ڈھونڈے۔

اسی وقت اجنبی نے میری طرف دیکھا، مسکرایا، ہنسنے لگا۔ پھر یکایک اداس ہو گیا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور کچھ اس قدر دھیرے سے کہا کہ الفاظ تو مجھ تک پہنچ نہ سکے لیکن ایک ناگوار سی بو نے مجھے اپنے گھیرے میں ضرور لے لیا۔

میں جواب کیا دیتا، کچھ سنا ہی نہ تھا اور اس بو کا احساس نہ ہوتا تو شاید "جی! کیا فرمایا۔؟" کہہ کر اس سے پوچھ بھی لیتا۔ مجبوراً خاموشی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔
مجھے اپنی طرف متوجہ نہ پا کر اس نے دوبارہ کہا۔
"کیا ہو رہا ہے جی!"

"یہی بات اس نے شاید پہلے بھی کہی ہوگی۔ لیکن اس میں جواب دینے کی بات ہی کیا تھی۔ پہلے کچھ نہ سن پانے کی وجہ سے خاموش رہا تھا، اب سب کچھ سن کر بھی چپ چاپ بیٹھا رہا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"کیوں جی، تم نے کچھ بتایا نہیں۔" کہتے ہوئے وہ میری طرف ذرا سا کھسکا۔
میں بنچ کے کونے میں پہلے ہی سے بیٹھا تھا، کیا کرتا۔ بس اپنے کو پیچھے کی طرف ذرا سا اور سکیڑ لیا اور کچھ ایسے بیٹھا رہا جیسے اس نے وہ بات کسی اور سے کہی ہو۔ لیکن

دماغ اس اجنبی ہی میں اُلجھا ہوا تھا' تو اب میری طرف کچھ اور کھسک آیا تھا ۔
" کیا غم ہے جی! چلو سارے غم ایک گلاس میں دُور کروں "
ایک عجیب قسم کی تیز بو نے' جسے اس طرح کی بدبو بھی نہیں کہا جا سکتا جو گندے نالے اور نالیوں سے آتی ہے' دونوں نتھنوں کو بھر دیا تو میں نے اُٹھنے کی کوشش کی ۔
اجنبی نے ہاتھ پکڑ کر مجھے بٹھا دیا ۔" بیٹھو جی! تم تو ناراض ہو گئے میں نے کوئی بدتمیزی کی ہو تو دس جوتے مار لو " اس نے کہا اور اپنا سر جھکا دیا ۔
اب میں کیا کرتا؟ اس کے منھ سے آنے والی بو سے ناگواری کا احساس تو پیدا ہوا تھا لیکن یہ تکلیف اس بے نام سی الجھن سے بہرحال کم تھی جس میں تھوڑی دیر قبل تک مبتلا تھا ۔ پھر بھی ایک عجیب سی جھنجھلاہٹ نے مجھ پر قبضہ ضرور کر لیا تھا ۔" آیا تو تھا سکون کی تلاش میں' یہاں ایک نئی مصیبت گلے پڑ گئی ۔" میں نے اپنے آپ سے دل ہی دل میں کہا ۔ لیکن ہتھیار بھی ڈال دیے اور اسی کے لہجے میں گیند اس کے پالے میں ڈال دی ۔
" تم کیا کرتے ہو جی ؟ " مجھ کو اپنی ہی آواز انجانی انجانی سی لگی ۔
" یہ ہوئی نا بات ـــ! " اس نے " نا " کو خوب کھینچا ۔" میں کیا کرتا ہوں ؟ ـ دن بھر گدھے کی طرح کام اور شام کو یہ ۔" اس نے انگلیوں کا ایک گولہ سا بنا کر ہاتھ اپنے منہ کی طرف اس طرح بڑھایا جیسے ایک گلاس اور چڑھا رہا ہو ۔
" اپنی چھاتی بھی جلاتے ہو اور پیسہ بھی ۔"
لیکن قبل اس کے کہ میں اپنا جملہ پورا کر سکوں' اس نے جواب اجنبی نہیں رہ گیا تھا' کہا: " سینہ تو جلنا ہی ہے' یہ نہ کروں تو دنیا بھر کی فکریں اسے جلا ڈالیں گی "
میں کچھ لاجواب سا ہو گیا' لیکن اتنی آسانی سے ہار ماننے کو میرا جی نہ چاہا ۔
" پھر بھی ـ "
" پھر بھی کیا ـ؟ تم اپنا سینہ جلنے سے کیسے بچاتے ہو ـ؟ " کہتے ہوئے

اس نے میرے چہرے، کپڑوں اور چپلوں پر ایک نظر ڈالی اور اپنی بات جاری رکھی ۔
"سچ بول کے، بے ایمانی نہ کر کے کسی کو دھوکا نہ دے کے ۔ چوبیسوں گھنٹے ایسے بنے رہتے ہو جیسے گنگا اشنان کر کے بس چلے آ رہے ہو ۔"

میں خاموش رہا ۔

"کیوں ہے نا یہی ۔" اس نے میرا ہاتھ ہلایا لیکن بات رسان سے کی ۔

میں نے سر ہلا کر اس کی بات مان لی ۔

" اپنا اپنا سوچنے کا طریقہ ہے ۔ تم کسی کا برا نہیں کرتے، نہ اچھے کا نہ برے کا، ٹھیک ہے ۔ لیکن کیا برے کا برا نہ کرنا ایمان داری ہے ۔؟ اچھا اسے چھوڑو ۔ کیا میں اپنے اس شوق سے کسی کا برا کرتا ہوں ۔؟"

اس نے "شوق" پر زور دینے کے لیے یہ لفظ ادا کرتے ہوئے اپنی آواز ذرا اونچی کر لی ۔

اب ہم دونوں میں تھوڑی بہت دوستی ہو چکی تھی ۔ کم سے کم اجنبیت کا کوئی احساس تو باقی نہیں رہ گیا تھا ۔

" آؤ جی ! کوئی بری بات نہیں ۔ بس ذرا سا اپنے کو بھلا کے تو دیکھو ۔ ہر وقت اپنے آپ کو یاد رکھنا اور یہ سوچنا کہ کوئی دیکھ نہ لے اچھا نہیں ہوتا ۔ اپنے آپ کو اپنے آپ سے تھوڑی دیر کے لیے آزاد کر کے تو دیکھو پھر جب خود سے ملو گے تو کچھ ایسا مزا آئے گا جیسا پہلی ملاقات میں آتا ہے ۔"

میں نے اپنے چاروں طرف جو دیوار کھڑی کر رکھی تھی اس کا مسالہ تو پہلے ہی بھربھرا گیا تھا، اب اینٹیں بھی کھسکنے لگی تھیں ۔ اس کی بات کا ایسا جواب جو اسے خاموش کر دے، مجھے نہ سوجھا تو میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا ۔

"پھر کبھی ۔"

" دیکھو جی بیس برسوں سے ہر شام یہاں آرہا ہوں' بس ہر شام ہی سمجھو' نوکری سے زیادہ پابندی سے ۔ ان سارے برسوں میں مشکل سے دس پندرہ شامیں' بیس پچیس سمجھو' گھر میں گذاری ہوں گی ۔ نہیں تو بس' یہی پارک' یہی بینچ اور میں ——— میڈ فار ایچ اَدر کا" ماملا ہے.
اس نے کہا تو ایسا لگا جیسے کوئی عورت اس کے دماغ میں ہو۔

" بیس سال !" مجھے واقعی حیرت ہوئی ۔

" اور کیا جی ۔ دن دوسروں کا' جن کے لیے خوب جی لگا کر کام کرتا ہوں اور شامیں میری اپنی۔ نہ دن کے کام میں اپنی شاموں کو دخل دینے دیتا ہوں' نہ اپنی شاموں میں دن کے کام کو ۔"

میں اسے ایک ٹک دیکھتا رہا' لیکن بولا کچھ نہیں ۔ اب وہ مجھے تھوڑا اچھا لگنے لگا تھا۔ لیکن ایک بات تھی ۔ نہ اُس وقت بھی اسے کسی چیز کی پروا معلوم ہوتی تھی جب وہ میرے لیے بالکل اجنبی تھا' نہ اس وقت جب اس کے منہ سے نکلنے والے بھبکوں سے میرے چہرے سے اس کے لیے شدید ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا اور نہ اب جب اس کی باتوں میں مجھے مزا آنے لگا تھا۔

" یہاں سے اٹھوں گا ـــ " اس نے کہا " تو راستے میں تھوڑی سی اور چکھ لوں گا آؤ۔ ہو جائے ۔" اس نے اس بار میرا کندھا پکڑ کے ہلایا۔ " ایسی نیند آئے گی کہ ساری زندگی یاد رکھو گے ۔"

" پھر کبھی سہی ۔ اس وقت میں ذرا جلدی میں ہوں ۔" میں نے اپنی بزدلی اور اپنے طے کیے ہوئے راستے کو وقت کی کمی کی بیساکھی کا سہارا دیا ۔

" جو ہونا ہے' ابھی ہوتا ہے یا پھر کبھی نہیں ہوتا ۔ اب جانے کب ملاقات ہو' ہو نہ ہو ـــ" ایک ایک لفظ اس نے بہت دھیرے دھیرے ادا کیا۔

" ہو گی' ہو ہی جائے گی ـــ" میں نے اسے پیچھے دیکھا تو اُس کی اُمیّد

،ڈور کو سونت کر مضبوط بنا دینے میں مجھے کوئی حرج نظر نہ آیا۔ پھر میں نے اپنی بات
ں وزن پیدا کرنے کے لیے یہ بھی جوڑ دیا۔
"میں تو پندرہ بیس برسوں سے یہاں آیا ہی نہ تھا۔" اور یہ سچ بھی تھا۔
"لیکن اب ضرور آیا کروں گا۔" میں نے یقین دلایا۔
"تو وعدہ رہا۔"
میں نے کوئی جواب تو نہ دیا لیکن اسے میرے چہرے پر انکار ہرگز نظر نہ آیا ہوگا۔
وہ خاموشی سے اُٹھا۔ اس نے چند قدم چلنے کے بعد پلٹ کر میری طرف دیکھا
مسکرایا اور ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے بولا۔
"اپنی نیکی خوب اچھی طرح سنبھال کے رکھنا۔ دیکھو اسے گلاس چھو نہ جائے۔"
میں جواب کیا دیتا۔ سچ پوچھیے تو میرے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا بھی نہیں
بس اسے جاتے ہوئے بہت دور تک دیکھتا رہا۔ بالکل خالی الذہن۔ لیکن کچھ کچھ
افسوس بھی تھا کہ اب شاید ہی اس سے ملاقات ہو۔

■■